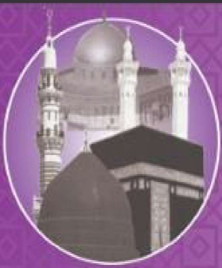


مجلہ صفدر



اکابرین اہل سنت (دیوبند) بالخصوص
شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی
کے افکار و نظریات کا بے باک ترجمان

اکتوبر تا دسمبر 2023ء — ربیعین ر جمادی الاولیٰ ۱۴۴۵ھ

152–154

قرآن کے متعلق سنت کی مرضی نہیں چلتی کہ عام کو خاص اور خاص کو عام کرے، مگر غامدی گروہ کی مرضی چلتی ہے کہ یہ چاہیں تو عرب کے مشرکین کی آیت عام بنالیں، اور چاہیں تو عام آیت وحدیث عرب کے مشرکین کے ساتھ خاص کردیں۔ یہاں غامدی صاحب کے پاس: سوائے اپنا من پسند مطلب کشید کرنے کے کیا دلیل ہے جس کی بنیاد پر یہ آیت قیامت تک کے لوگوں کے لیے عام قرار پائی؟ [غامدی اجتہادات: ۸۷]

لیکن ہمارے ہاں ایک عرصہ سے "تکفیر" کی مذمت اور حوصلہ شکنی کرنے پر ہی اکتفاء کیا جاتا رہا، دوسرے پہلو کی اہمیت کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہیں مل سکی، اس لیے اس کا فطری نتیجہ یہی ظاہر ہوا کہ "تکفیر" کے باب میں "تفریط" کی عادت بڑھتی رہی، چنانچہ بہت سے ایسے افراد و جماعتوں کی تکفیر سے بھی پہلوتہی کی جاتی ہے جن کی تکفیر کرنا اصولی لحاظ سے جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہوجاتا ہے۔ [تکفیر میں تفریط: ۶۸]

حضرت شیخ الکلؒ کے وصال سے قبل دارالعلوم دیوبند کی ویب سائٹ سے ایک فتویٰ مشتہر ہوا تھا۔ اُس فتوے میں یزید کو "تابعی" بلکہ "امیر المؤمنین" قرار دیتے ہوئے فسق یزید پر اصرار کو تشیع سے متاثر ہونے کی علامت باور کیا گیا تھا۔ اس وقت شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ ہی وہ واحد بزرگ تھے جنھوں نے اپنے ایک مؤقر مکتوب کے ذریعے دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کو اس تسامح کی طرف متوجہ فرمایا تھا۔ حضرت شیخ الکلؒ کے اس مکتوب پر مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندرؒ، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے بھی تائیداً دستخط فرمائے تھے۔ اس مکتوب کے جواب میں مولانا ابوالقاسم نعمانی [مہتمم: دارالعلوم دیوبند] نے حضرت شیخ الکلؒ کی خدمت میں اپنا مکتوب ارسال فرماتے ہوئے تصریح فرمائی تھی کہ دارالعلوم کے دارالافتا سے اس نوعیت کے فتوے کا اجرا واقعی جمہور اہل سنت کے نقطۂ نظر سے انحراف ہے، ان شاء اللہ، جلد ہی اس سلسلے میں وضاحت مشتہر کی جائے گی۔ [مولانا سلیم اللہ خانؒ اور ناصبیت: ۶۴]

ہماری دست بستہ درخواست ہے کہ حضرت قاضی (مظہر حسین) صاحبؒ کے آثار و شذرات کو یوں فرد واحد کے انتخاب اور پسند وناپسند پر نہ چھوڑا جائے، بلکہ اس سلسلے میں حضرت قاضی صاحب کے فکر، ذوق اور مزاج کے حامل اصحاب علم کی ایک مستقل کمیٹی تشکیل دی جائے جو باہمی مشاورت کے بعد فیصلہ کرے کہ کیا شائع کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر کام حضرت قاضی صاحب کی عظیم شخصیت کے لیے نیک نامی کا سبب نہیں بن رہے۔ حضرت قاضی صاحب تو اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں، آنے والی نسلیں ان ہی کتابوں کے آئینے میں ان کی شخصیت اور ان کے کام کا تعین کریں گی۔ اس لیے اس سلسلے میں پوری حکمت اور بصیرت کے ساتھ نہایت احتیاط اور کڑے انتخاب کی ضرورت ہے۔ [مولانا سلیم اللہ خانؒ اور ناصبیت: ۶۵]

بیاد
محدث عصر ... حضرت مولانا شیخ الحدیث
محمد سرفراز خان صفدر نوراللہ مرقدہ

بفیضان
حضرت مولانا
قاضی مظہر حسین نوراللہ مرقدہ
حسین احمد مدنی

مظہریہ دار المطالعہ
0312 4612774 0334-4612774
khadim.khan4@yahoo.com

فہرست

قارئین صفدر توجہ فرمائیں!

-مجلّہ صفدر کا شمارہ نمبر 119 تا 127 (جنوری تا ستمبر ۲۰۲۱ء) ”علامہ ڈاکٹر خالد محمود نمبر“ تھا۔

-128 (اکتوبر ۲۰۲۱ء) تا 138 (اگست ۲۰۲۲ء) تمام شمارے ترتیب سے شائع ہوتے رہے۔

-شمارہ 139 تا 142 (ستمبر تا دسمبر ۲۰۲۲ء) ایک خاص شمارہ ہے، جو تا حال زیر ترتیب ہے۔ مکمل ہونے پر شائع ہوگا۔ اِن شاء اللہ

-143 تا 151 (جنوری تا ستمبر ۲۰۲۳ء) بھی تمام شمارے ترتیب سے شائع ہوتے رہے۔

-اس کے بعد ایک سال مجلّہ تعطّل کا شکار رہا۔

-152 تا 154 (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۳ء) کا شمارہ اَب (ستمبر ۲۰۲۴ء میں) شائع کیا جا رہا ہے۔

-155 تا 163 (جنوری تا ستمبر ۲۰۲۴ء) اور بعد کے شماروں کے لیے بھی دُعا فرمائیں۔

پیام صفدر مدیر کے قلم سے

مسجد اقصیٰ اور مسئلہ فلسطین

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

بیت المقدس سرزمینِ انبیاء اور اہلِ ایمان کی عقیدتوں کا مرکز ہے، جب اسے مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا، تب اس پر نصاریٰ قابض تھے، سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے زیرِ کمان لشکر نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قبلہ اول مسلمانوں کو واپس مل گیا۔

حضرات مفسرینِ کرامؒ نے لکھا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی حفاظت کا ذمہ خود اُٹھایا ہے، جبکہ بیت المقدس کی آزادی اور انتظام کا حصول مسلمانوں کے سپرد ہے، جب تک وہ اطاعت الٰہی خصوصاً جہاد کا فریضہ بجالاتے رہیں گے، بیت المقدس کا انتظام ان کے پاس رہے گا، اور جب وہ اپنی ذمہ داری سے غافل ہوجائیں گے، تب اُن کا قبلہ اول بھی اُن سے چھن جائے گا۔ (لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ یہود کا حق بحال ہوجائے گا، بلکہ حق تولیت تاقیامت امتِ مسلمہ کا ہی برقرار رہے گا۔) اور اُس کا حصول اُن پر لازم ہوگا۔

دورِ فاروقی کے تقریباً ساڑھے چار سو سال بعد جب مسلمان تین مختلف خلافتوں میں بٹے ہوئے تھے، تب نصاریٰ نے ۷۰/ ہزار مسلمانوں کو شہید کرکے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا۔ اور ۸۸/ سال کی طویل جدوجہد کے بعد سلطان صلاح الدینؒ کے ہاتھوں بیت المقدس فتح ہوا۔

۱۹۲۲ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد برطانوی استعمار نے فلسطین پر اپنی عملداری قائم کرلی، جب کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد دنیا بھر سے کئی لاکھ یہودیوں کو وہاں بسانے اور لاکھوں فلسطینی مسلمانوں پر ظلم وستم کرکے ان کو جبراً جلاوطن کرنے کے بعد برطانیہ وہاں سے رخصت ہوا تو بیت المقدس کو اُردن نے اپنے زیرِ انتظام لے لیا۔

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے ناجائز وجود کا اعلان ہوا، اس وقت فلسطین کا مختصر سا علاقہ اسرائیل کے قبضے میں تھا، اسرائیل نے اپنے ناجائز قبضے کو وسعت دیتے دیتے ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور اب ''غزہ'' کے علاوہ تقریباً پورے فلسطین پر اسرائیل قابض ہے۔

۱۹۸۷ء میں شیخ احمد یاسینؒ کے ہاتھوں وجود میں آنے والی مزاحمتی تحریک ''حرکۃ المقاومۃ الاسلامی'' (حماس) اہلِ فلسطین کی دِل کی آواز اور ان کے قومی موقف کی ترجمان بن کر سامنے آئی۔ ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو ''حماس'' کے بری، بحری اور فضائی حملے نے نہ صرف اسرائیل کے ہوش اُڑا کر رکھ دیئے، بلکہ اُس کی عسکری قوت کا دنیا بھر میں تماشا لگا دیا۔ اسرائیل اپنی تاریخ کی بدترین شکست پر پردہ ڈالنے کے لیے (امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی تائید کے ساتھ) غزہ کے نہتے عوام پر بمباری کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے اور ۲۹/مارچ ۲۰۲۴ء کی رپورٹ کے مطابق اَب تک ۱۴،۳۵۰/بچوں، ۹،۴۶۰/خواتین سمیت ۳۲،۷۰۵/لوگ شہید ہو چکے ہیں، جبکہ ۷،۰۰۰/افراد لاپتہ اور ۷۵،۱۹۰/زخمی ہیں۔[1]

جدید ترین ٹیکنالوجی، ہر قسم کے اسلحہ اور بے پناہ وسائل رکھنے والا اسرائیل اس بربریت، سفاکیت اور قتلِ عام کے فرعونی عمل کے ساتھ ۱۷۵/روز گزرنے کے باوجود بھی ''حماس'' کے جانبازوں کے مقابلے میں ٹھہرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے، نہ ہی ''حماس'' کو کوئی قابلِ ذکر نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسرائیل اور اس کے حواریوں کو مکمل طور پر ناکام اور حماس اور فلسطینی مسلمانوں کو ہر میدان میں پوری طرح کامیاب فرمائیں۔

چند سال قبل لاہور میں ''مسجد اقصیٰ اور مسئلہ فلسطین'' کے عنوان پر ایک نشست میں بندہ کو گفتگو کا موقع ملا تھا، اُس نشست کے شرکاء میں سے ایک نیک بخت نے ۱۴،۱۵/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو ''مسجدِ اقصیٰ'' نامی دو روزہ آن لائن ورکشاپ کا اہتمام کر کے اس میں بندہ کو دو گھنٹے گفتگو کرنے کا موقع مہیا کیا۔ اس ورکشاپ میں کی گئی گفتگو کی تحریری صورت میں برقی اشاعت بھی ہو چکی ہے۔ الحمد للہ!

قارئین صفدر کے لیے اُسی گفتگو کے اہم نکات اختصار کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔ اللہ رب العزت بیت المقدس سمیت پورے فلسطین کو مکمل آزادی اور اہلِ فلسطین کو فتح اور عافیت نصیب فرمائیں۔ آمین بجاہ النبی الکریم

خادم اہل سنت حمزہ احسانی غفرلہ......۱۹/رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ، ۳۰/مارچ ۲۰۲۴ء

---

[1] اور اِس تحریر کی اشاعت کے وقت شہداء کی تعداد ۴۰/ہزار جبکہ زخمیوں کی تعداد ۹۳/ہزار سے زائد ہے۔

(ا)-باب اول: سرزمینِ شام کا تاریخی پس منظر:

فلسطین دراصل ملک شام کا ایک صوبہ تھا۔ سوریہ، لبنان، اُردن، فلسطین (چاروں) اُس وقت شام ہی میں شامل تھے۔ اُس وقت شام کی حدود عراق، ترکی اور مصر سے ملتی تھیں۔ فلسطین دنیا کے قدیم علاقوں میں سے ایک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ: سیدنا نوح علیہ السلام کے فرزند سام بن نوح شام میں تشریف لائے تھے، اُن کی نسل سے یہ آباد ہوا۔ لہٰذا اُنہی کے نام ''سام'' سے موسوم ہوا، جو رفتہ رفتہ ''شام'' بن گیا۔

اولادِ نوح میں سے ایک عظیم ہستی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دَور، دَورِ نوح سے تقریباً ایک ہزار سال بعد کا بتایا جاتا ہے۔ اُن کا اصل علاقہ تو عراق تھا، لیکن وہ ہجرت کر کے مصر اور پھر فلسطین پہنچے اور وہیں رہائش پذیر ہو گئے۔ اولادِ ابراہیم میں سے سیدنا اسماعیل علیہ السلام تو بحکم خداوندی مکہ شریف پہنچائے گئے، پھر وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ جبکہ سیدنا اسحاق علیہ السلام اور اُن کے فرزند سیدنا یعقوب علیہ السلام فلسطین میں ہی رہے۔ اولادِ یعقوب میں سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو جب کنویں میں ڈالا گیا تو اُنہیں نکالنے والا شخص اُن کو مصر لے گیا۔ بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے اہل خانہ کو بھی وہیں بلوالیا۔ یوں تمام اولادِ یعقوب (بنی اسرائیل) فلسطین سے مصر جا بسے۔

اولادِ یعقوب میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا دَور، دَورِ یوسف کے تقریباً ۴۰۰ر سال بعد بتایا جاتا ہے۔ فرعون اور آل فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل مصر سے نکلے، اُس وقت بنی اسرائیل کے وطن (فلسطین) پر قوم عمالقہ قابض تھی۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل نے سیدنا یوشع بن نون علیہ السلام کی سربراہی میں جہاد کر کے فلسطین حاصل کیا اور پھر سے اپنے وطن میں آباد ہو گئے۔

اولادِ یعقوب (بنی اسرائیل) میں سے سیدنا داؤد علیہ السلام اور اُن کے فرزند بے مثال بادشاہ سیدنا سلیمان علیہ السلام بھی فلسطین میں ہی تھے۔ جنھوں نے جنات سے مسجد اقصیٰ کی شاندار عمارت بنوائی۔

سوال: مسجدِ اقصیٰ کی بنیاد کس نے رکھی؟

جواب: اِس سلسلے میں مختلف اَقوال ہیں۔

۱- بنیاد سیدنا داؤد علیہ السلام نے رکھی، تکمیل سیدنا سلیمان علیہ السلام نے فرمائی۔

۲- پہلی تعمیر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے تعمیرِ جدید کی۔

ایک روایت کے مطابق ''اس دنیا کی پہلی مسجد، مسجدِ حرام ہے اور دوسری مسجد مسجدِ اقصیٰ ہے۔''

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ: ''مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کے درمیان چالیس (۴۰) سال کا عرصہ ہے۔'' (غالباً اس روایت کی بنیاد پر یہ قول اختیار کیا گیا کہ مسجدِ حرام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنائی اور ان کی اپنی رہائش فلسطین میں تھی تو ۴۰ رسال بعد مسجدِ اقصیٰ بھی انھوں نے ہی بنائی ہوگی۔)

اِسی روایت کی بنیاد پر کچھ محققین کا کہنا ہے کہ: بیت اللہ شریف کی اول تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتوں کے ساتھ مل کر کی، لہٰذا پہلی مسجد مسجدِ حرام ہے اور اس سے چالیس سال کا حساب لگانے پر معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس/ مسجدِ اقصیٰ کی پہلی تعمیر بھی حضرت آدم علیہ السلام نے فرمائی۔

۳۔ محققین کا زیادہ رجحان اس بات کی طرف ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی اس کی تعمیرِ نو: جس کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام نے کی، پھر مسجدِ اقصیٰ کو تعمیر کیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے پھر اپنے زمانے میں مسجدِ اقصیٰ کی تعمیرِ جدید کروائی۔

بنی اسرائیل کی نافرمانی اور بیت المقدس سے جلاوطنی:

بنی اسرائیل کو تورات میں بار بار تنبیہ کی گئی تھی کہ: خدا تعالیٰ سے کیے گئے وعدے پورے کروگے تو بیت المقدس پر تمہارا حق رہے گا۔ نافرمانی کروگے تو نہ صرف یہ کہ حق ختم ہو جائے گا، بلکہ ذلیل کر کے نکالے بھی جاؤ گے۔ چنانچہ جب بنی اسرائیل نے نافرمانیوں کی انتہاء کردی، انبیاء کے قتل تک کے مرتکب ہوئے تو بخت نصر نامی بادشاہ ان پر مسلط ہوا، جس نے مسجد کو تباہ و ویران کر دیا، تورات کے نسخے جلا دیئے اور تمام بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ساتھ لے گیا۔ ۷۰ رسال بعد ایک فارسی بادشاہ نے بیت المقدس کو آباد کیا اور بنی اسرائیل کو وہاں واپس آنے کی اِجازت ملی! اُس وقت بنی اسرائیل کے پاس تورات نہیں رہی تھی، البتہ تورات کے ایک حافظ سیدنا عزیر علیہ السلام اُن کے ہمراہ تھے، جنھوں نے ان کو تورات لکھوادی۔ یوں اُنھیں کھویا ہوا مذہب واپس مل گیا۔ لیکن بنی اسرائیل کی عادتیں اور حرکتیں وہی رہیں۔ چنانچہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری سے تقریباً تین صدیاں قبل یونانی حکمران سکندرِ اعظم، بنی اسرائیل پر مسلط ہوا۔ اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا۔ اور اڑھائی پونے تین صدیاں گزرنے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ۶۰، ۶۵ رسال قبل ایک رومی بادشاہ بیت المقدس پر قابض ہوگیا۔

اِس دوران یہودیوں کی شرارتیں برابر جاری رہیں۔ سیدنا زکریا و یحییٰ علیہما السلام کو شہید کیا۔ مقامی حکمران کے ساتھ ساز باز کر کے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو شہید کرنے کی پوری منظّم منصوبہ بندی کرلی۔ مگر اللہ پاک نے اُنھیں زندہ آسمان پر اُٹھالیا تو یہود اپنے مذموم مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔

۷۰ء میں ٹیٹس نامی بادشاہ نے بیت المقدس پر حملہ کیا، مسجد کو تباہ کر دیا۔ اور اکثر یہود کو فلسطین سے جلاوطن کر دیا۔ ۲۰۰ء کے قریب ایک رومی (مسیحی) بادشاہ نے بیت المقدس کو اپنے زیر انتظام لیا تو مسیحیت (عیسائیت) کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوگئی اور بچے کھچے یہودی بھی وہاں سے نقل مکانی کر گئے۔

۲۰۰ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک تقریباً دو ہزار (۲۰۰۰ء) سال یہود بیت المقدس میں قدم نہیں جما سکے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہود دنیا بھر میں بکھرے ہوئے تھے، جبکہ فلسطین نصاریٰ کے پاس تھا۔ ''غزہ'' اُس وقت کی عالمی تجارتی منڈی تھی۔ اہل عرب بھی وہاں برائے تجارت جایا کرتے تھے۔

اہم نکتہ:

نبی پاک ﷺ کی بعثت اور دَورِ عمرؓ میں فتح بیت المقدس کے وقت وہاں یہودی نہیں عیسائی قابض تھے۔ اِسی طرح سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے مقابل بھی یہود نہیں نصاریٰ تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ: سرزمین فلسطین اور بیت المقدس کے حوالے سے مسلمانوں کا یہود سے کبھی جھگڑا رہا ہی نہیں۔

مسلمانوں کے قلوب میں بیت المقدس کا احترام بٹھایا جاتا ہے:

بیت المقدس یہود کا قبلہ تھا، یہودی ٹھہرے انبیاء کے قاتل اور خدائی لعنت کے مستحق! قرآن کی نظر میں مغضوب وملعون! لہٰذا مسلمانوں کو بجا طور پر یہود سے للہ فی اللہ شدید نفرت ہے۔ ممکن تھا کہ یہود کی وجہ سے اُن کے قبلے سے نفرت بھی ہوتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کا حق تولیت امتِ مسلمہ کو دیدیا تھا۔ لہٰذا اہل اسلام کے قلوب میں اُس کی محبت بٹھانے کے لیے اُدھر رُخ کر کے نمازیں پڑھوائی گئیں۔ نیز یہود کو بھی اسلام کی طرف میلان کا موقع مہیا کیا گیا۔

معراج کی رات مسجدِ اقصیٰ کے بانیین ومعماران سمیت تمام بنی اسرائیلی انبیاء کو بیت المقدس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقتدی بنا کر بتا دیا گیا کہ: بحکم خداوندی سب نے یہاں سرکارِ دو عالم اور اُن کی اُمت کا حق تولیت وامامت تسلیم کر لیا ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سفر بیت المقدس میں جو حالات پیش آئے، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ نصاریٰ نے بھی مسلمانوں کا حق تسلیم کرتے ہوئے انتظام حوالے کر دیا۔

دورِ فاروقی سے تقریباً ۴۶۰ ؍ سال بعد تک بیت المقدس مسلمانوں کے زیر انتظام رہا۔ مختلف تعمیرات ہوتی رہیں۔ عبدالملک بن مروان نے سنہری گنبد بنوایا۔

پھر جب مسلمان تین (اُموی، عباسی، فاطمی) خلافتوں میں بٹ کر اپنی حکومتوں میں مگن تھے، عیسائیوں نے ۷۰/ہزار مسلمان شہید کرکے ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس پر قبضہ جمالیا۔

۸۸/سالہ طویل جدجہد کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں ۱۱۸۷ء بیت المقدس واپس مسلمانوں کو ملا۔

۱۵۱۶ء ۹۳۴ھ میں ترکی کے سلطان سلیم اول نے قبضہ کرکے سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا۔

۴۰۰/سال تک فلسطین خلافتِ عثمانیہ کا صوبہ رہا۔

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد برطانیہ نے وہاں قبضہ جمالیا۔ تو کچھ عرصہ برطانوی استعمار کے قبضے میں رہا۔ ۱۹۴۸ء میں اُردن نے حاصل کرلیا۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل قابض ہوگیا۔ (اِس طرح مجموعی طور پر تقریباً بارہ سو (۱۲۰۰) سال بیت المقدس مسلمانوں کے زیرِ انتظام رہا۔)

(۲)-باب دوم: مسئلہ فلسطین اور اسرائیل کی حقیقت:

یہود خود مردِ میدان نہ تھے، چنانچہ ۱۹/ویں صدی کے آخر میں اُنھوں نے مسلمانوں کے خلاف نصاریٰ کو استعمال کرکے بیت المقدس پر قبضے کا منصوبہ بنایا۔ نصاریٰ چونکہ یہود کو اپنے نبی کا قاتل قرار دیتے ہیں، لہٰذا پہلے ۱۸۹۷، ۱۸۹۸ء میں دو عالمی کیتھولک کانفرنسوں کے ذریعہ نصاریٰ سے یہ اعلان کرایا گیا کہ: ”ہم یہود کو اپنے نبی کے قتل کے الزام سے بری قرار دیتے ہیں۔“ اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں جنگ عظیم اول کے موقع پر اِس شرط پر برطانیہ کی بھرپور مالی مدد کی گئی کہ: فلسطین یہودیوں کو دلوایا جائے گا۔

۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم اول ختم ہوئی، اس کے بعد منظّم منصوبہ بندی کے تحت ”خلافتِ عثمانیہ“ کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے ۱۹۲۲ء میں اس خاتمے کے بعد برطانوی استعمار کے زیر سایہ دنیا بھر سے یہودیوں کو فلسطین میں لا لا کر بسایا گیا، اور وہاں کے لاکھوں مقامی مسلمانوں کو لالچ، دھونس، جبر، تشدد اور قتل وغارت گری کے حربوں کے ذریعے جبراً بے وطن کردیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں فلسطین کی تین حصوں میں تقسیم کا فارمولا پیش کیا گیا، لیکن مسلمانوں اسے مسترد کردیا۔ ۱۹۳۹-۱۹۴۵ء جنگ عظیم دوم کے دوران فلسطینی مسلمانوں پر ظلم اور یہودیوں کی فلسطین منتقلی کا سلسلہ تیزی سے جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے حوالے کردیا۔ اور ۱۴/مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان کردیا گیا۔

برطانیہ نے جب اپنے جانے کا اعلان کیا تو اُردن نے آگے بڑھ کر بیت المقدس پر قبضہ کرلیا، اس

طرح بیت المقدس اُردن کے اور کچھ فلسطینی حصہ اسرائیل کے قبضے میں رہا، جبکہ بقیہ حصہ فلسطینی مسلمانوں کے پاس رہا۔ اس کے ۲۰ ر سال بعد ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مصر، شام، عراق کے ساتھ لڑائی کر کے ان کے ممالک کے کئی علاقوں کے ساتھ بیت المقدس کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔

۱۹۷۴ء میں ایک اور لڑائی ہوئی، جس میں مصر نے اپنے کچھ حصے اسرائیل سے واپس لے لیے، لیکن بیت المقدس اسرائیلیوں کے قبضے میں رہا اور صحرائے سیناء بھی اسرائیل کے قبضے میں رہا۔

گویا ۱۹۶۸ء میں اسرائیل کا بیت المقدس پر قبضہ ہوا تھا اور اب ۲۰۲۴ء ہے، یعنی تقریباً ۵۷، ۵۸ ر برس سے ہمارا قبلۂ اول اسرائیلیوں کے قبضے میں ہے۔

اسرائیلی مظالم کی ایک جھلک:

اقوام متحدہ کے ۱۹۴۸ء کے منظور کردہ نقشے کے مطابق ناجائز ریاست اسرائیل کا رقبہ پانچ ہزار تین سو (۵،۳۰۰) مربع میل تھا۔ لیکن اسرائیل نے رفتہ رفتہ تیئس ہزار (۲۳،۰۰۰) مربع میل پر قبضہ کر لیا۔ اور اِس پر بس نہیں، ''عظیم تر اسرائیل'' کے نقشے میں مصر، عراق، شام، سعودیہ عرب حتیٰ کہ مدینہ منورہ، خیبر، تک کو اسرائیل کا حصہ دِکھایا گیا ہے۔

یہودیوں کے فلسطین میں ظلم وتشدد کے پیش نظر مظلوم فلسطینی عوام نے اپنے دفاع کے لیے تنظیمیں تشکیل دیں۔ (۱)- فتح تنظیم [۱۹۵۷ء] (۲)- تنظیم آزادئ فلسطین [۱۹۶۴ء] (۳)- حماس [۱۹۸۷ء]

سابقہ دو تنظیموں کی کارکردگی سے مایوسی کے بعد شیخ احمد یاسین نے ۱۹۸۷ء میں ''حماس'' کی بنیاد رکھی۔ ۲۰۰۴ء میں شیخ احمد یاسین کو شہید کر دیا گیا۔ ۲۰۰۷ء میں حماس نے فلسطینی عوام کا بھرپور اعتماد حاصل کر کے غزہ کے انتخابات میں کامیابی پائی۔ تب سے اَب تک اسرائیل نے ''غزہ'' کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ: ''غزہ اِس وقت دنیا کی سب سے بڑی جیل ہے۔'' یہود ر اسرائیلی جب چاہتے ہیں اہل غزہ کا پانی، بجلی، سوئی گیس، یہاں تک کہ خوراک، ادویات تک بند کر دیتے ہیں۔ غزہ کے ایک جانب سمندر، ایک طرف مصر اور ایک طرف خود اسرائیل ہے۔ سمندر بھی اسرائیلی قبضے میں ہے۔ ظلم کی انتہا یہ ہے کہ اسرائیل نے پچاسی فیصد پینے کا پانی اپنے قبضے میں کیا ہوا ہے اور صرف پندرہ فیصد پانی فلسطینی مسلمانوں کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ وہ بھی جب چاہتا ہے بند کر دیتا ہے۔

اِس وقت تقریباً ۸۰ ر لاکھ یہودی ظلماً فلسطین پر قابض ہیں، جبکہ ۸۰ ر لاکھ ہی فلسطینی ہجرت کی

زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، جن میں ۴۵ / لاکھ سے زائد تعداد مہاجر کیمپوں میں مقیم ہے۔

۲۰۱۸ء کی ایک رپورٹ کے مطابق گزشتہ چند سال سے اسرائیل اوسطاً ۲۸۵ / فلسطینیوں کو بلا وجہ سالانہ شہید کرتا ہے۔ اور یہ عام ایام کی بات ہے، جن ایام میں فضائی بمباری جاری ہو اُن دِنوں شہدا کی تعداد یومیہ بیسیوں اور سیکڑوں میں ہوتی ہے۔

اکتوبر ۲۰۰۱ء تا جنوری ۲۰۰۵ء تک ساڑھے چھ سو سے زائد فلسطینیوں کے گھر بلا وجہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیئے گئے۔

۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۶ء کی رپورٹس کے مطابق خواتین کو اسرائیلی چوکیوں پر ایسے وقت میں قصداً روکا گیا، جب ولادت کا وقت قریب تھا، اور ۶۸ / خواتین نے چیک پوسٹوں پر بچے جنم دیئے۔ جن میں سے ۴ / خواتین اُسی موقع پر شہید ہوئیں۔

۱۹۶۸ء کی لڑائی میں ساڑھے تین لاکھ فلسطینیوں کو شہید کیا گیا۔

اسلامی ممالک اور اسرائیل:

۱۹۷۴ء تک عرب ممالک نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں امریکہ نے مصر کو ڈرا دھمکا کر، لالچ دے کر مجبور کیا تو مصر نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیا، اس کے بعد اُردن نے بھی اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ یوں فلسطین کے دو اہم ہمسایہ ممالک سے بزورِ ناجائز اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرایا گیا۔

موجودہ دور میں اسرائیل سے متعلق تین مؤقف پائے جاتے ہیں:

۱- اسرائیل، امریکہ وغیرہ:

ان کا موقف ہے کہ: بیت المقدس سمیت فلسطین کے جتنے حصے پر اسرائیل قابض ہے، وہ اسرائیل کا حصہ ہیں۔ جلاوطن کیے گئے فلسطینی جہاں کہیں جائیں، فلسطین میں اُن کی کوئی جگہ نہیں۔ بیت المقدس اسرائیل کا دارالحکومت ہوگا۔

۲- ترکی، اُردن، مصر:

وہ اسلامی ممالک، جنھوں نے اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے، اُن کا موقف یہ ہے کہ: ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ نے جو رقبہ اور حدود اسرائیل کے لیے طے کیا تھا، اسرائیل اُن کے اندر رہے، بیت المقدس اور باقی فلسطین کو آزاد کرے۔ وہ اسرائیل کا حصہ نہیں ہے۔

۳- پاکستان اور سعودیہ عرب وغیرہ:

وہ ممالک جنھوں نے اسرائیل کے ناجائز وجود کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ان کا موقف یہ ہے کہ: یہودی پورے فلسطین پر غاصبانہ قبضہ ختم کریں، اُن کے پاس یورپی ممالک کی شہریتیں موجود ہیں۔ وہ ۱۹۲۲ء میں اور اس کے بعد جہاں جہاں سے اُٹھ کر فلسطین آئے تھے، وہاں واپس جائیں۔

اور قضیہ فلسطین کا حل ۱۹۴۸ء کے بجائے ۱۹۱۷ء کی پوزیشن پر حل کیا جائے۔ جب خلافتِ عثمانیہ کی عملداری تھی اور فلسطین کے اندر کسی یہودی کو مستقل رہنے کی اجازت نہیں تھی۔

اسرائیل اور پاکستان:

بانی پاکستان محمد علی جناح نے اسرائیل کو: ''مغربی طاقتوں کا ناجائز بچہ'' قرار دیتے ہوئے اعلان کیا کہ: ''اسرائیل امت مسلمہ کے سینے میں گھونپا ہوا خنجر ہے پاکستان اس کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا۔'' بلکہ اسرائیل بننے سے آٹھ سال پہلے ۱۹۴۰ء میں پیش ہونے والی قراردادِ پاکستان میں بھی یہ بات شامل تھی کہ: ''فلسطین میں ایک صہیونی ریاست کے قیام کے منصوبہ پر کام جاری ہے، پاکستان اُسے کبھی تسلیم نہیں کرے گا۔''

یہ تو اسرائیل کے بارے میں پاکستانی موقف تھا۔اَب ذرا پاکستان کے بارے میں اسرائیلی عزائم ملاحظہ ہوں! جب اسرائیل قائم ہوگیا تو اسرائیل نے اپنی پہلی خارجہ پالیسی میں کہا تھا کہ: ''اسرائیل کے قیام کے مقاصد میں سے ایک مقصد اسلام کے نام پر بننے والی نئی ریاست کا خاتمہ بھی ہے۔(یعنی اسرائیل کے قیام کا مقصد پاکستان کا خاتمہ بھی ہے۔)''

اَب اسرائیل، امریکہ اور اس کے حواری عرصہ دراز سے ہر قسم کا دباؤ، لالچ وغیرہ استعمال کر کے اِس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح سعودیہ عرب اور پاکستان بھی اسرائیل کو تسلیم کرلیں۔

مسئلہ فلسطین: دو ریاستی موقف یا ایک ریاستی؟

یاد رہے کہ: قراردادِ پاکستان (۱۹۴۰ء) سے اَب تک فلسطین کے حوالے سے پاکستان کا ''ایک ریاستی موقف'' چلا آرہا ہے۔ ''دو ریاستی موقف'' تو اُن ممالک کا ہے جنھوں نے اسرائیل کے ناجائز وجود کو تسلیم کررکھا ہے۔لیکن حیرت، افسوس اور شرم کی بات ہے کہ: اسرائیل کی حالیہ وحشیانہ بمباری کے آغاز سے بعض غدارانِ ملک وملت یہ کہتے پھررہے ہیں کہ: مسئلہ فلسطین کا حل ''دو ریاستی موقف'' ہے۔اور اِسے پاکستان کا موقف قرار دیتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرمارہے۔اور بعض چابک دستوں نے مغالطہ دہی کے لیے ایک لفظ کا اضافہ کرلیا ہے کہ: ''پاکستان کا ''سیاسی'' موقف تو دو ریاستی ہی ہے۔'' شاید اُنھوں نے اپنی ذات کا

نام پاکستان رکھ لیا ہے، اِس لیے اُن کو ایسا لگ رہا ہے۔ ورنہ حقیقت میں پاکستان کا ریاستی موقف ''ایک ریاستی'' ہی ہے۔ چنانچہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ سمیت متعدد حضرات بارہا تنبیہ فرما چکے ہیں کہ: ''دو ریاستی موقف کی بات سے گریز کیا جائے۔''

(۳)-باب سوم: بیت المقدس اور یہود: قرآن کریم کی روشنی میں:

اس ضمن میں چار نکات قابل غور ہیں:

۱-متعدد قرآنی آیات میں سرزمین فلسطین وشام کو ''بابرکت'' قرار دیا ہے۔

[دیکھیے: بنی اسرائیل:۱، مائدہ:۲۱، اعراف:۱۳۷، انبیاء:۷۱، انبیاء:۸۱، مومنون:۵۰، قصص:۳۰، سبا:۱۸]

۲-اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ: سرزمین فلسطین ہم آپ کی اولاد کو عطا فرمائیں گے۔ یعنی یہاں کا حق تولیت آپ کی اولاد میں رہے گا۔ چنانچہ اسحاق علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک یہ حق اولادِ ابراہیم کی ایک شاخ (بنو اسحاق) کے پاس رہا۔ اور اس کے بعد اولادِ اسماعیل کی دوسری شاخ بنو اسماعیل کے پاس آ گیا۔ لہٰذا نبی پاک کی بعثت کے بعد اس کی تولیت کے حق دار مسلمان ہیں۔

۳-سورۂ انبیاء:۱۰۵ رمیں ارشاد ہے کہ: ''اس زمین (شام و فلسطین) کے وارث ہمارے صالح بندے ہوں گے۔'' اور نبی آخرالزماں کی بعثت کے بعد اُن کا کلمہ پڑھے بغیر کوئی صالح نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اِس زمین کے وارث صرف مسلمان ہیں۔

۴-یہود کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ تھی کہ نافرمانی کی صورت میں اُن کا حق تولیت ختم ہو جائے گا۔ قرآن پاک میں جابجا اُن پر لعنت بلکہ تا قیامت لعنت کا تذکرہ بالکل واضح ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا حق تولیت قیامت تک ختم ہو چکا ہے۔

(۴)-باب چہارم: سرزمین شام فلسطین اور بیت المقدس: احادیث مبارکہ کی روشنی میں:

احادیث طیبہ میں بہت سے فضائل وارد ہوئے ہیں: مثلاً

۱-تین مساجد کی طرف بنیت ثواب سفر کرنے کی اجازت ہے، جن میں مسجد اقصیٰ بھی شامل ہے۔

۲-ایک کمان کے برابر جگہ سے بیت المقدس کی زیارت کرنا دنیا بھر سے بہتر ہوگا۔

۳-دعائے سلیمانؑ: صحیح نیت سے بیت المقدس میں نماز پڑھنے والا پاک صاف ہو جائے۔

۴-ارشادِ نبوی: آزمائش کے موقع پر بیت المقدس کو لازم پکڑ لینا۔

۵-فتنوں کے وقت شام میں ایمان محفوظ ہوگا۔

۶- بیت المقدس کے پاس ایک گروہ جہاد کرتا رہے گا، جو قیامت تک غالب رہے گا۔

۷- سفرِ معراج کے دوسرے حصے کا آغاز اِسی سرزمین سے ہوا۔

۸- تاریخ انسانی کا عظیم ترین اجتماع: تمام انبیاء اکٹھے ہوئے۔ حضور ﷺ نے امامت فرمائی۔

۹- مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے مابین چالیس سال کا فاصلہ ہے۔

۱۰- مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔ ۱۶، یا ۱۷ ر مہینے اس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھی گئیں۔

۱۱- قیامت کی چھ نشانیاں شمار کرو، ان میں سے ایک فتح بیت المقدس بھی ہے۔

۱۲- نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار گنا زیادہ۔ بعض روایات میں پچاس ہزار گنا۔

۱۳- پہلی مسجد مسجد حرام، دوسری مسجد اقصیٰ۔

۱۴- مسجد اقصیٰ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنائی۔

۱۵- ملک شام تو تمام شہروں میں میرا منتخب خطہ ہے۔

۱۶- دجال پوری دنیا کا چکر لگائے گا، چار جگہ نہ جا سکے گا: مکہ، مدینہ، مسجد اقصیٰ، جبل طور۔

(۵)- باب پنجم: مسجدِ اقصیٰ کے دیگر فضائل واہمیت:

- اس کے چاروں طرف انبیاء کرام مدفون ہیں۔
- زبور، انجیل اور شاید تورات بھی فلسطین میں نازل ہوئی۔
- چاروں آسمانی کتب کے ماننے والوں کی اس مقام سے عقیدت وابستہ ہے۔
- جن ۲۵ ر انبیاء کا قرآن میں ذکر ہے، اُن میں سے ۱۲ ر نبی شام و فلسطین میں تشریف لائے۔
- اول القبلتین، ثانی المسجدین، ثالث الحرمین!

(۶)- باب ششم: محل وقوع اور حدود:

چند نام: ۱- بیت المقدس ۲- القدس ۳- ایلیاء ۴- یروشلم (پرانا نام)

محل وقوع:

بیت المقدس، برّاعظم ایشیاء کے مغرب میں ہے، بحرِ ابیض متوسط کے جنوبی کنارے پر واقع ہے، اس علاقے کو مشرقِ وسطیٰ کہا جاتا ہے۔ لبنان، خلیجِ عقبہ، مصر اور اُردن کی سرحدیں اس کے ساتھ ملتی ہیں۔ گویا آپ کہہ لیں کہ فلسطین کے شمال میں لبنان، شمال مشرق میں شام، اور مشرق میں اُردن ہے، جبکہ جنوب مغرب میں مصر ہے اور مغرب کی سمت بحرِ ابیض متوسط ہے۔

جغرافیائی شکل:

فلسطین مستطیل سی (لمبائی والی) شکل پر مبنی ہے اور شمالاً جنوباً اس کی لمبائی تقریباً ۴۳۰ر کلومیٹر ہے۔ جبکہ چوڑائی کہیں ۵۰ر سے ۶۰، ۷۰ر کلومیٹر، کہیں ۹۰ر سے ۷۰، ۸۰ر کلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ ۱۱۷ر کلومیٹر اس کی چوڑائی ہے۔ بس یہی اس کی کل لمبائی چوڑائی ہے۔ اگر دنیا کے نقشے میں دیکھیں فلسطین بالکل چھوٹا سا ہے جو بمشکل دِکھائی دیتا ہے۔ اس میں سے بھی ۸۵ر فیصد حصہ پر اسرائیل قابض ہے اور صرف ۱۵ر فیصد فلسطینیوں کے لیے بچا ہوا ہے۔

رقبہ:

فلسطین کا کل رقبہ ۲۷ر ہزار کلومیٹر بتایا جاتا ہے۔

بیت المقدس کے احاطے کا رقبہ ایک لاکھ چوالیس ہزار مربع میٹر ہے۔ یعنی یہ سارا علاقہ تقریباً ایک مربع کلومیٹر سے کچھ اوپر بنتا ہے۔ اور شہر بیت المقدس بہت قدیم ہے، وہی چار دیواری اور اس میں بہت سی عمارتیں، جہاں عیسائیوں نے کسی زمانے میں اپنے گرجا گھر بھی بنائے ہوئے تھے، وہیں وہ سُنہری قبہ (گنبدِ صخرہ)، وہیں مسجد ہے اور وہیں وہ دیوار ہے جسے یہودی دیوارِ گریہ کہتے ہیں۔ وہاں ایک جدید شہر بھی ہے۔ احاطہ بیت المقدس کے سات دروازے بتائے جاتے ہیں اور اس احاطہ میں مساجد کی تعداد بھی سات ہی بتائی گئی ہے۔ قابض اسرائیلی پولیس بیت المقدس کے دروازوں پر ہر وقت موجود رہتے ہیں، جب چاہتے ہیں انہیں بند کر دیتے ہیں جب چاہتے ہیں انہیں کھول دیتے ہیں، بلا اِجازت کسی کو اندر نہیں جانے دیتے۔

اہم نکتہ:

۱۹۱۸ء تک اس پورے احاطے کو ''الاقصیٰ'' کہا جاتا تھا، پھر کسی نے صرف مسجد کو مسجدِ اقصیٰ کہنا شروع کر دیا اور کسی نے اس سنہری گنبد کو! حالانکہ وہ پورا اِحاطہ ہی بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ ہے۔

(۷)-باب ہفتم: حق تولیت کے دلائل:

۱-انبیاء کے تعمیر کردہ مقامات کا حق تولیت صرف اُن کو ہے جو تمام انبیاء پر ایمان رکھیں۔

۲-مقدس مقامات: خدا کی عبادت کے لیے ہیں، دیگر مذاہب کا وقت ختم ہو چکا، اور خدا تعالیٰ نے اُنھیں منسوخ قرار دیدیا۔ مسجد اقصیٰ پر حق تولیت مذہبی حیثیت سے تھا، جب مذہب ہی ختم تو حق بھی ختم۔

۳-شام انبیاء کی سرزمین ہے، یہودی انبیاء کے قاتل ہیں۔ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا۔

۴-مسجد اقصیٰ خالص مسلم (نبی) نے بنائی، یہود کافر ہیں۔کافر مسلمان کی جگہ کا حق دار نہیں۔

۵-وراثتِ فلسطین مسلمانوں کو من جانب اللہ عطا ہوئی ہے۔قیامت تک اُنہی کا حق ہے۔

۶-نصاریٰ نے علامات دیکھ کو مسلمانوں کا حق تولیت تسلیم کیا۔

۷-عیسائیوں نے دوبارہ قبضہ کیا،تو جہاد کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔

۸-امام مہدی کا مرکز بھی فلسطین ہوگا۔حدیث شریف میں ارض فلسطین کی طرف ہجرت کی پیشین گوئی کے ساتھ ساتھ اس کی ترغیب بھی ہے، چنانچہ اسے ہجرت مدینہ کی طرح قرار دیا گیا ہے۔

۹-عیسیٰ علیہ السلام اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے دجال کو قتل بھی فلسطین میں ہی کریں گے۔

۱۰-تورات کے اعلان کے مطابق نافرمانیوں کی وجہ سے یہود کا حق تولیت ختم ہو چکا ہے۔

۱۱۔دجال بیت المقدس میں داخل نہ ہوسکے گا۔دجال یہودی ہے،حق یہود ہوتا تو وہ ضرور جاتا۔

ملاحظہ:

انبیاء، کتاب اللہ، شعائر اللہ کے استہزاء اور بے ادبی کی وجہ سے قوم یہود ملعون و مغضوب بنادی گئی ہے، ان پر خدا کی مار ہے، انبیاء کی بددعا کی پھٹکار ہے، جو ان کا ساتھ دے گا، وہ بھی اس میں حصہ دار ہوگا۔

(۸)-باب ہشتم: مسلمان کہلانے والے مسجد اقصیٰ کے چند غدار:

[۱]-جاوید غامدی [۲]-عمار خان ناصر غامدی [۳]-محمد خان شیرانی۔

۱)-غامدی کا تازہ بیان:

فلسطینیوں کو صرف سیاسی جدوجہد کا حق حاصل ہے۔مسلح جدوجہد کی گنجائش نہیں۔

غامدی کی یہود نوازی:

اسرائیلی یہودی مصنفہ اپیکا ابراہمن کا بیان:

”جاوید احمد غامدی اسلامی دنیا کا واحد شخص ہے جو اسرائیلی موقف کی تائید کرتا ہے اور فلسطینیوں کو ان کی جدوجہد پر موردالزام ٹھہراتا ہے۔اسرائیلی حکومت کو چاہیے کہ اس کی مالی اور اخلاقی مدد جاری رکھے، اور اسے مزید سپورٹ کرے۔“ [ضرب مومن: ۶ تا ۱۲ اپریل ۲۰۱۸]

مزید کا لفظ بتاتا ہے کہ پہلے بھی ”فیض“ جاری ہے۔

۲)-عمار خان ناصر کا موقف:

''ہیکل سلیمانی پر یہود کا اُصولی حق برقرار ہے۔''

قابل توجہ: اِس احاطہ کو قرآن نے ''مسجد اقصیٰ'' کہا اور عمار ناصر نے ''ہیکل سلیمانی''۔

۳)-شیرانی کی دلیل:

اسرائیل و فلسطین کا مسئلہ دینی و شرعی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے، لہٰذا یہودیوں کا قومی حق تسلیم کر لینا چاہیے۔

جواب: تورات اور یہودیت کے منسوخ ہونے کے بعد مذہبی حیثیت تو ختم ہو چکی، البتہ نسلی اور قومی حق ہے۔ اس کے لیے فلسطین کا انتخاب غلط ہے، جو مسلمانوں کا مقدس مقام ہے۔ اور من جناب اللہ اس پر تا قیامت مسلمانوں کا ثابت شدہ ہے۔

(۹)-باب نہم: ایک فلسطینی سے سوال جواب:

سوال: آپ لوگ اسرائیلی حکومت کو یہاں سے نکال نہیں سکتے تو اتنی قربانیوں کا فائدہ؟

جواب: [۱] مسجد اقصیٰ روئے زمین پر فرشتوں اور آدم علیہ السلام کی بنائی ہوئی دوسری مسجد ہے۔ اور مسجد ''وقف'' ہوتی ہے۔ کسی مسلمان کو حق نہیں کہ جیتے جی مسجد کافر کے حوالے کر دے۔

[۲] آدم علیہ السلام، ان کے بعد اِس خطے میں آنے والے تمام انبیاء اور اُن کے ماننے والے سب مسلمان تھے، اسلام ہی اصل دین ہے، ہم مسلمان ہی ان سب کے وارث ہیں، لہٰذا یہ مقدس مقام انبیاء کے منکرین و قاتلین کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں؟

[۳] معراج کی رات تمام انبیاء نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھی، گویا یہ مقدس مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے امت مسلمہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اب اس کی حفاظت امت مسلمہ کے ہر ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔

[۴] یہودیوں کو یہاں سے ہم نے نہیں نکالا تھا، بلکہ تورات میں جگہ جگہ تصریح موجود ہے کہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے انبیاء کی بدعا کے سبب اللہ تعالیٰ نے انھیں نکالا۔ ان مردود لوگوں کو ہم یہ مقدس خطہ دے کر اُن کی مردودیت کیسے اپنے سر لے لیں؟

[۵] ہم یہودیوں کو یہاں سے نہیں نکال سکتے، نہ ہی اللہ تعالیٰ اب ان کو یہاں سے نکالے گا، بلکہ یہ ان کی قتل گاہ ہے۔ اَب انھیں جلا وطنی نہیں نسل کشی کی صورت میں سزا ملے گی، اور وہ ہم نہیں خود اللہ پاک دیں گے، ہم تو صرف اس کا ذریعہ اور سبب بنیں گے۔

[٦] القدس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ایسا تکوینی نظام رکھا ہے کہ یہودی ہر طرح کے اسلحے سے لیس اور مسلمان بالکل نہتے، لیکن مسلمانوں میں ایسی ہمت اور جرأت ہے کہ یہودی ان کے تندرست تو کجا عورتوں، بیماروں اور زخمیوں پر بھی قابو نہیں پا سکتے۔

(۱۰)-باب دہم: سرزمینِ فلسطین اور مسلمانوں کے فرائض وذمہ داریاں:

-اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق اپنا عقیدہ مضبوط رکھیں۔

ایک واقعہ:

ایک مرتبہ ایک مسلمان نے ایک یہودی سے کہا کہ: ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہم مسلمان تمہیں گاجر مولی کی طرح کاٹیں گے، پتھر اور درخت بھی تمہیں جگہ/ پناہ نہیں دیں گے، تم جہاں چھپو گے وہ کہیں گے: یہ ہمارے پیچھے اللہ کا دشمن چھپا ہوا ہے۔''

تو یہودی کہنے لگا: ''بالکل ایسا وقت آئے گا، لیکن تب آئے گا جب تم (مسلمان) عقیدے میں ہماری طرح مضبوط ہو جاؤ گے، ابھی نہیں کہ جیسے ابھی تمہارے عقائد کمزور ہیں، ہم پیسے دیتے ہیں تم بِک جاتے ہو، کمزور پڑ جاتے ہو، ہم ڈراتے ہیں تم ڈر جاتے ہو، (ہم تمہیں دھمکاتے ہیں) تم دب جاتے ہو۔''

مسلمانوں پر عائد ذمہ داریاں:

۱-اہل فلسطین خصوصاً مجاہدین کے لیے دعائیں۔

۲-عملاً اس جہاد میں شرکت

۳-بھرپور مالی تعاون۔[دار العلوم کراچی کی طرف سے امداد بھیجنے کا سلسلہ جاری ہے۔]

۴-فلسطین خصوصاً غزہ کے تازہ حالات سے آگاہی

۵-ہر جگہ اہل فلسطین کی حمایت وطرف داری

۶-مظاہروں اور احتجاج کے ذریعہ حکمرانوں پر دباؤ!

۷-بیت المقدس کی تاریخ، فضائل، اہمیت سے آگاہی اور دوسروں تک پہنچانے کی فکر!

۸-بیت المقدس کے لیے زبان وقلم کا مسلسل استعمال

۹-فلسطین اور مجاہدین کے خلاف بولنے/لکھنے والوں کا تعاقب اور منہ توڑ جواب!

۱۰-اسرائیلی مصنوعات کا دائمی اور پختہ بائیکاٹ۔

☆......☆......☆......☆

مولانا جمیل الرحمٰن عباسی

حضرت سیدنا زید بن خطاب رضی اللہ عنہ

متمم بن نویرہ عرب کا نامور مرثیہ گو گزرا ہے، ان کے بھائی مالک بن نویرہ قتل ہو گئے تو متمم نے وہ غضب کا مرثیہ کہا کہ ہر سننے والے پر ایک قیامت برپا ہو گئی، متمم کے اشعار سن کر ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل غمزدہ ہو جاتا، چند اَشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

لقد لامنی عند القبور علی البکاء رفیقی لتذراف الدموع السوافک

فقال اتبکی کل قبر رایتہ لقبر ثوی بین اللواء فالدکادک

فقلت ان الاسی یبعث الاسی فدعنی فھذا کلہ قبر مالک

ترجمہ: قبروں کے پاس میرے بہتے آنسو دیکھ کر میرے دوست نے ملامت کرتے ہوئے کہا: تم لواء ،ثوی اور دکادک (نامی مقامات) کی قبریں دیکھ کر کیوں روتے ہو؟ میں نے کہا: ایک غم دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیتا ہے (میری نظروں میں) یہ ساری قبریں مالک کی ہی قبریں ہیں۔ (البدایہ والنہایہ)

حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطابؓ نے بھی متمم بن نویرہ سے وہ قصیدہ سنا جو اس نے اپنے بھائی پر کہا تھا اور سن کر فرمایا: ”**لو کنت احسن الشعر لقلت فی اخی زید مثل ما قلت فی اخیک.** اگر مجھے اشعار کہنا آتے تو میں بھی اپنے بھائی زید کا ویسا ہی مرثیہ کہتا جیسا تو نے اپنے بھائی مالک کا کہا ہے۔“ متمم نے جواب دیا: ”**لو ان اخی ذھب علی ما ذھب علیہ اخوک ما حزنت علیہ.** جس شان اور راستہ پر آپ کے بھائی جان سے گزرے ہیں، اگر میرے بھائی بھی اسی راہ پر مارے جاتے تو مجھے غمزدہ ہونے کی کیا ضرورت تھی؟“ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”**ما عزانی احد باحسن مما عزیتنی بہ.** مجھ سے جس طرح آپ نے تعزیت کی ہے، ایسی تعزیت کسی نے نہیں کی“۔

حضرت سیدنا زید بن خطاب رضی اللہ عنہ حضرت عمرؓ کے بھائی ہیں، دونوں کے والد خطاب بن نفیل ہیں، البتہ دونوں کی والدہ الگ الگ ہیں، حضرت عمرؓ کی والدہ کا نام حنتمہ تھا، جبکہ حضرت زید بن خطاب کی والدہ کا نام اسماء بنت وہب تھا، حضرت زیدؓ کی کنیت ابو عبدالرحمٰن تھی، آپؓ مہاجرین اولین میں سے تھے، حضرت عمرؓ سے عمر میں بھی بڑے تھے اور اسلام بھی حضرت عمرؓ سے پہلے قبول فرمایا، مواخات کے وقت آنحضرت ﷺ نے حضرت زیدؓ اور حضرت سعد بن عدیؓ کو باہم بھائی بنایا، آپؓ طویل قامت اور گندمی

رنگ کے تھے، بدر واحد اور دیگر تمام معرکوں میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے،۱۲ھ میں جنگ یمامہ میں شہادت کے مقام پر فائز ہوئے، جنگ یمامہ میں اسلامی لشکر کا جھنڈا آپؓ کے ہی پاس تھا، آپؓ گھمسان کی لڑائی میں علَم تھامے آگے ہی بڑھتے رہے، یہاں تک کہ دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ مرتدین کے ایک بڑے کمانڈر رحال بن عنفوہ کو آپؓ نے ہی قتل کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: میں ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا، جماعت میں رحال بن عنفوہ بھی موجود تھا، اسی موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”**ان فیکم لرجلا ضرسه فی النار مثل احد.** تم میں ایک آدمی ایسا ہے جس کے دانت جہنم کے اندر اُحد پہاڑ کے برابر ہوں گے۔“

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: اس مجلس میں بیٹھے ہوئے تمام حضرات وفات پا گئے، صرف میں اور رحال باقی بچ گئے اور میں مسلسل خوفزدہ رہا، یہاں تک کہ رحال مرتد ہوکر مسیلمہ کذاب کے پاس چلا گیا اور اس جھوٹے مدعی کی نبوت تسلیم کرلی اور حضرت زید بن خطابؓ کے ہاتھوں مارا گیا اور عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔

بعض روایات میں آتا ہے ابو مریم حنفی نے حضرت زید کو شہید کیا تھا، بعد میں ابو مریم بھی مخلص مسلمان بن گئے، ابو مریم نے ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ سے کہا: ”**یا امیر المؤنین ان اللہ اکرم زیدا بیدی ولم یھنی بیدہ.** اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں حضرت زید کو عزت دی (کہ وہ شہادت کے منصب پر فائز ہوئے) اور ان کے ہاتھوں مجھے اللہ تعالیٰ نے ذلیل نہیں کیا۔ (کہ میں اگر ان کے ہاتھوں مارا جاتا تو کفر کی حالت پر مرتا اور ہمیشہ کے لیے ذلیل ہو جاتا)۔“

حضرت سیدنا عمر فاروقؓ اپنے بھائی کی شہادت پر بہت مغموم رہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: ”**ما ھبت الصبا الا وانا اجد فیھا ریح زید.** جب بادِ صبا چلتی ہے تو اس سے زید کی مہک آتی ہے اور میں زید کی خوشبو محسوس کرتا ہوں“۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: غزوہ احد میں حضرت عمرؓ نے اپنے بھائی حضرت زید سے کہا: آپ میری زرہ لے لیں: حضرت زیدؓ نے فرمایا: ”**انی ارید من الشھادۃ ما ترید.** جس شہادت کے آپ متمنی ہیں میں بھی اسی شہادت کا آرزو مند ہوں۔“ پھر وہ زرہ دونوں نے چھوڑ دی۔

جب حضرت زید کی شہادت کی خبر حضرت عمر کو ہوئی تو آپؓ نے فرمایا: ”**رحم اللہ اخی، سبقنی الی الحُسنیَین: اسلم قبلی، واستشھد قبلی.** اللہ تعالیٰ میرے بھائی پر رحم فرمائے، وہ دو چیزوں میں مجھ پر سبقت کر گئے: (۱) اسلام مجھ سے پہلے قبول فرمایا۔ (۲) شہادت کا مرتبہ بھی مجھ سے پہلے پا گئے۔ [الاستیعاب، اسد الغابہ۔ ج:۲، الاصابہ، ج:۲] **رضی اللہ تعالی عنه وارضاہ.** ☆☆

انجم نیازی

سیّدنا زید بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ستاروں کی طرح روشن تھی پاکیزہ جبیں تیری
قدم بوسی کیا کرتی مدینے کی زمیں تیری

عمرؓ جیسے بہادر شیر کا ہے تُو بڑا بھائی
ہوا کرتی تھی ہر اِک بات سچی اور حسیں تیری

مقدس اور پاکیزہ لبوں کو جب ہلاتا تھا
بکھر جاتی تھی خوشبو میٹھی میٹھی ہی وہیں تیری

کسی معمولی شئے کو تُو کہاں ساتھی بناتا تھا
ہوا کرتی تھی قدسیّوں کی خوشبو ہم نشیں تیری

بہت عرصہ ہوا دنیا سے رخصت ہوگیا لیکن
اَبھی یادیں نہیں بھولے مدینے کے مکیں تیری

بنالوں اپنی آنکھوں کا اُسے سرمہ عقیدت سے
اگر خاکِ کفِ پا مجھ کو مل جائے کہیں تیری

مدینے کو میں جب بھی یاد کرتا ہوں محبت سے
مرے دِل میں پلٹ آتی ہیں یادیں بھی حسیں تیری

دُعا کے واسطے جب اپنے ہاتھوں کو اُٹھاتا تھا
فرشتے چُومنے آتے محبت سے جبیں تیری

ترا جب ذِکر ہوتا تو محبت سے سُنا کرتے
ابوبکرؓ و عمرؓ دونوں امیر المؤمنیں تیری

وہ جتنے بھی صحابہؓ تھے، نبی کے جتنے ساتھی تھے
محبت سُنا کرتے وہ باتیں دِل نشیں تیری

تلاوت جب کِیا کرتا تُو قرآں رحل پر رکھ کر
پرندے جھومتے سُن کر صدائے دِل نشیں تیری

مرتب: مولانا مفتی شعیب احمد

مجلس: ۱۷

المجالس الحسنه

مجالس: مولانا مفتی محمد حسن مدظلہم [خلیفہ مجاز: حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ]

24/دسمبر 2013ء......۲۰/صفر المظفر ۱۴۳۵ھ۔منگل

حیلہ تملیک کی بنیاد

حدیثِ بریرہ رضی اللہ عنہا: ’’لك صدقة و لنا هدية‘‘ پر فرمایا: مدارس کی تملیک کے سلسلے اسی سے ماخوذ ہیں۔

تعاون کرنے پر شکریہ

’’اللھم صل علی آل أبی أوفیٰ ‘‘ زکوٰۃ کی ادائیگی پر آپ ﷺ نے یہ دعا دی تھی۔اس پر فرمایا: مدرسے سے کوئی تعاون کرے تو دعا دے دیا کریں۔ یہ نہیں سوچنا کہ ہمارے اوپر کون سا احسان کر رہے ہیں۔دعا دینا بھی سنتِ نبوی ﷺ ہے۔اس سے مسلمان کی دلجوئی بھی ہو جاتی ہے۔

معاملہ اوپر نیک ہونا چاہیے

بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے سے قرضہ لیا اور بروقت ادا کرنے کے لیے پہنچ نہ پانے کی وجہ سے لکڑی میں بند کر کے دریا برد کر دیا۔اور قرض خواہ نے اللہ کے حکم سے وہ پکڑ لیا اور وصول کر لیا۔اس پر فرمایا: میں عرض کروں جب معاملہ اوپر نیک ہو تو اللہ دلوں کو جوڑ دیتے ہیں۔اللہ غیب سے سبیل پیدا فرما دیتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ اور قرضے پر گذر

فرمایا: قرضہ لینا بلاضرورت مناسب نہیں۔اگر مجبوری ہو تو گنجائش ہے۔ہمارے ایک بزرگ تھے راؤ عبدالسلام صاحب رائے پوری رحمہ اللہ۔حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمہ اللہ کے خاندان سے تھے، بڑی محبت فرماتے تھے۔میرے پاس جو تولیے کا ٹکڑا اور دیگر تبرکات ہیں وہ انہوں نے ہی مرحمت فرمائے تھے۔فرماتے تھے حضرت شیخ العرب والعجم سید مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے میرے پیچھے ایک نماز ادا فرمائی تھی۔راؤ صاحب نے بتایا کہ: حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ نے ۲۵/سال قرضے پر گذارا کیا۔ہر ایک سے نہیں لیتے تھے بلکہ احباب مقرر فرما رکھے تھے،ایک سے لیا، مقررہ وقت پر دوسرے سے لے کر اسے ادا کر دیا،اس طرح گذر اوقات چلتی رہی۔

بلا ضرورت قرضے سے بچنا ہی چاہیے

فرمایا: قرضہ انتہائی مجبوری میں لینا چاہیے۔ ورنہ عام حالات میں گذارے کا مزاج بنانا چاہیے۔ قرضہ لینا بھی ہو تو عام آدمی سے لیا جائے۔ بنک سے قرضہ لینا تو توبہ! اجاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہاں ایک صاحب تھے پہلے اُن میں سے ایک آدھ آدمی کماتا تھا سارے گذارا کرتے تھے۔ لیکن جب اولاد جوان ہوئی تو انہوں نے ہوشیاری دکھائی اور بنک سے قرضہ لے لیا۔ بس پھر کیا تھا! سارا کاروبار برباد ہو گیا اور آپس میں بھی لڑائیوں تک نوبت جا پہنچی۔ اللہ بچائے، اللہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔

شروع میں حالات

حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی قبر یہاں قریب میانی قبرستان میں ہے۔ (بندہ کو) اُن سے ایک نسبت ہے، اُن کی عادت تھی کہ اپنے خرچے پر سفر پر تشریف لے جاتے تھے، اور میزبانوں سے ایک روپیہ تک نہیں لیتے تھے۔ میں نے بھی اُن کی سنت اپنانے کی نیت کی۔ شروع میں حالات آئے ایک وقت میں ۶۰، ۷۰ ہزار کا قرضہ ہو گیا۔ بھائی قطب ولی (حضرت کے خادم [ناقل]) کو لکھا دیا کرتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ پانچ / پانچ، دس / دس ہزار کر کے اُترا، اللہ کا شکر ہے۔ اب میرے اوپر الحمد للہ ایک آنے کا قرضہ نہیں ہے۔

چوبرجی کے مدرسے کے دو اساتذہ کا وظیفہ میں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، شروع میں پندرہ سو وظیفہ تھا۔ حالات آ گئے، بڑی پریشانی رہی۔ دل میں وسوسے کے درجے میں خیال آیا کہ تجھے کیا ضرورت تھی اپنے ذمے لینے کی، مدرسے والے کریں نہ کریں۔ دو ماہ تک (شعبان ورمضان) وظیفہ نہیں ملا۔ پھر ایک دن بھائی رضوان صاحب نے فون کیا کہ حضرت [اقدس سید نفیس الحسینی] شاہ صاحبؒ بلا رہے ہیں۔ اللہ نے حضرت کے دل میں بات ڈال دی۔ حضرت نے اتنے پیسے دیدیے جس سے بحمد اللہ سارا وظیفہ پورا ہو گیا۔ اَب بحمد اللہ میں نے یہاں کے علاوہ جامعہ عثمانیہ رائیونڈ کے بعض اساتذہ اور اِدھر اُدھر کئی اور ساتھی ہیں اُن کا وظیفہ اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ جو ماہانہ ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اَدا کروا دیتے ہیں۔

دین کی خدمت اور تنخواہ

جب میں گوجرانوالہ میں تھا، اُس وقت وہاں میرا پندرہ سو روپیہ وظیفہ تھا۔ پھر جب وہاں سے آیا تو یہاں چوبرجی والے استاد (قاضی عزیز اللہ) صاحبؒ نے والد صاحب کے ذریعے سے پیغام بھیجا کہ: ''حسن نوں کہنا کہ جگہ ایتھے وی ہے پر تنخواہ تھوڑی اے'' (حسن سے کہنا: جگہ تو یہاں بھی ہے لیکن تنخواہ کم ہے۔) جب یہاں آ گیا تو بارہ سو روپے وظیفہ مقرر ہوا، استاد صاحب نے فرمایا تھا: ''مدرسے کا نام ''محمدیہ'' ہے، بس محمد ﷺ کے نام کی لاج رکھنی ہے۔'' پتہ نہیں کس درد سے استادوں نے یہ بات فرمائی تھی!!!

حالات آئے، معاشی تنگی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ایک دفعہ بچے کا آپریشن کروانا تھا، لیکن بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے مؤخر کرنا پڑا۔ پھر بعد میں اللہ کا شکر ہے بندوبست ہو گیا۔ ایک دفعہ دورے کے لیے طلبہ آگئے، لیکن گندم نہیں تھی۔ ساری رات مولانا عمار صاحب کی والدہ نے گندم صاف کی۔ وہاں ہم لینے گئے۔ بس اس کے بعد اللہ کا شکر ہے گندم کبھی ختم نہیں ہوئی۔ میرا وظیفہ چاہے جتنا بھی تھا، کبھی کسی سے اضافے کا مطالبہ نہیں کیا۔

پیٹ کا دروازہ بند رکھنا چاہیے

آپ حضرات کے سامنے یہ باتیں بیان کرنے اور بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے دین کا کام کرنا ہے، حالات آتے ہیں، اگر بات سامنے ہو تو تسلی ہو جاتی ہے۔ میں نے مدرسے سے اپنی ذات کے لیے کبھی قرض نہیں لیا۔ اسی طرح غریب رشتہ داروں کو بھی کبھی قرض لے کر نہیں دیا۔ اسی طرح جو ساتھی [میری] خدمت کرتے ہیں ان کا بھی اِس مدرسے تعاون نہیں کرتا۔ یہ کچھ اُصول ہیں جو میں نے اپنے لیے طے کر رکھے ہیں۔ بس کیا کریں، احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ پیٹ کا دروازہ کھل جائے تو پھر بند کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بھائی [مولوی] عزیز اللہ ہیں [حضرت کے ڈرائیور] اُن کا وظیفہ بھی میرے اپنے ذمے ہے۔ ایک صاحب ذاتی تعلق والے تھے ایک دفعہ آگئے، بڑی حاجت اور مجبوری کا اظہار کیا۔ دو لاکھ کے قریب اُن سے تعاون کیا، لیکن لکھ لیا اور بتایا کہ اگر فوت ہو جاؤں تو زمین بیچ کر بھی پورا کیا جائے۔ لیکن اللہ نے جلد ہی بندوبست کر دیا۔ برطانیہ کے دورے پر گیا وہاں لوگوں نے پونڈوں میں ہدیے دیے وہ بھی لا کر سارے مدرسے میں جمع کروا دیے۔

اپنی ذاتی ضروریات تو میری کیا ہیں؟ کپڑے لینے کے لیے مجھے کبھی بازار نہیں جانا پڑا۔ جوتا ہے ایک عرصے سے وہی زیرِ استعمال ہے۔ برطانیہ پہلے سال گیا تو بعض ساتھیوں نے دوسرا جوتا دے دیا۔ میں نے پہن تو لیا لیکن اُلجھن ہی رہی۔ دوسرے سال گیا تو اپنا یہی جوتا [ربڑ کی ہوائی چپل] لے کر گیا۔ چوبرجی والے استاد صاحب کا تقریباً تیس سال تک ایک ہی جوتا تھا، جس کا تلوا لکڑی کا تھا اور اوپر پلاسٹک / کپڑے کے تسمے وغیرہ تھے۔

بس میرے عزیز! پیٹ پر پتھر باندھنے کا مزاج بنانا ہے۔ ابتدا پتھروں سے ہو گی، پھر اللہ پراٹھے بھی کھلا دے تو اس کا انعام ہے، لیکن اگر ساری زندگی حالات ہی میں کٹ جائے تو پھر بھی اس راستے کو نہیں چھوڑنا۔

پھر تو تم سیٹھ بنو گے

مولانا اسماعیل صاحب رحمہ اللہ تھے، حضرت شیخ العرب والعجم سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے شاگرد

تھے،فرماتے: جب دورہ سے فارغ ہوا اور حضرت رحمہ اللہ سے ملاقات کے لیے گیا تو حضرت نے پوچھا کیا کروگے؟ عرض کیا کہ صبح کے وقت تجارت کروں گا اور ساتھ کچھ اسباق وغیرہ دیکھ لوں گا۔حضرت نے فرمایا:

''پھر تو تم سیٹھ بنو گے سیٹھ''۔

توجہ اس طرف دلائی کہ اصل مقصد کیا ہے۔حضرت مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم العالیہ بڑے حضرات ہیں، ایک دفعہ بیان میں فرمانے لگے:۔علماء کو تجارت بھی کرنی چاہیے [غالبًا الفاظ یہ تھے: میری خواہش ہے کہ ایسے علماء ہوں جو صبح کو تجارت کریں اور شام کو اسباق پڑھائیں یا شام کو تجارت کریں اور صبح کو اسباق پڑھائیں اور مدرسے سے ایک روپیہ بھی نہ لیں۔از مرتب] مجھے خدشہ ہو رہا تھا۔بعد میں یہ مضاربت والی ناخوشگوار صورت پیش آ گئی۔

علماء کا کام تو دین کی خدمت ہے

بھائی! تمھاری [اہل علم اور علماء کی] تجارت تو علم ہے۔آپ لوگ روٹی چٹنی پر گذارے کا مزاج بناؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ فتوحات بھی عطا فرما دیتے ہیں۔حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے پردے کے پیچھے خزانے چھپا رکھے ہیں۔جب ضرورت پڑتی ہے پردہ اٹھا کر جتنی ضرورت ہو دیدیتے ہیں، رونے کے بعد دیدیں یا پہلے دیدیں۔''

بیماری میں بھی قرض نہ لیا

فرمایا: چوبرجی والے استاد صاحب رحمہ اللہ نے دو تھیلیاں بنا رکھی تھیں۔ایک میں مدرسے کے پیسے تھے،دوسری میں ذاتی۔ایک دفعہ سخت بیمار ہوگئے دوائی لینے کے لیے پیسے چاہیے تھے،ذاتی تھیلی دیکھی تو خالی تھی۔مدرسے والی میں تھے،لیکن مدرسے کی تھیلی سے رقم نہیں لی۔بیماری پر صبر کر لیا۔استاد صاحب رحمہ اللہ نے ہر ہر چیز کا روزنامچے میں حساب رکھا تھا۔ماچس اتنے آنے کی،فلاں چیز اتنی،فلاں اتنی،ایک ایک پائی پیسے کا حساب تھا۔کبھی دکھائیں گے آپ کو روزنامچہ۔[ان شاء اللہ] یہ جو کچھ آپ کو نظر آ رہا ہے یہ انہی کے تقوے اور اخلاص کی برکت ہے۔

اس مدرسے [جامعہ محمدیہ] کے گیس کے میٹر کا کوئی مسئلہ تھا،جس کی وجہ سے بل نہیں آ رہا تھا۔پانچ سال تک بل نہیں آیا۔ہم نے معلوم کروایا محکمے میں آدمی بھیجا،کوئی ایسا مسئلہ تھا کہ اگر ہم ساری عمر ٹھیک نہ کرواتے تو بھی چلتا رہتا۔لیکن علوم دین کے طلبہ ہیں،ان کے لقمے میں کوئی ایسی چیز چلی جائے تو یہ مناسب نہیں اور مدرسے کے لیے بھی یہ بات زیب نہیں دیتی۔مولانا امجد فاروق صاحب کے ذمہ لگایا انہوں نے

بڑی مشکل سے چکر لگا لگا کر پچھلا سارا حساب لگوایا تو پانچ لاکھ کے قریب بل بنا۔ ہم نے نیت کر لی تھی کہ ادا کرنا ہے، چاہے کچھ بھی ہو۔ اللہ نے کیا کہ اس کا بندوبست ہو گیا اور ادا کیا۔

پیری مریدی مزے کی چیز ہے؟

فرمایا: میں تو سمجھتا تھا: پیری مریدی بڑے مزے کی چیز ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ بھاری ذمہ داری ہے، یہ تو پیٹ پر پتھر باندھنے کی چیز ہے۔ اگر تھوڑی سی بے احتیاطی ہو تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ اللہ بچائے۔ اللہ اپنی حفاظت میں رکھے۔

متاعِ دنیا اور اہلِ علم

ایک ساتھی نے عرض کیا حضرت ''حب دنیا'' کا باب مطالعہ کیا ہے۔ حب دنیا کا پتہ کیسے چلے گا کہ میرے اندر ہے یا نہیں؟ فرمایا: بس وہی علامت ہے کہ گناہ کر کے مال کمانا۔ اگر یہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

ایک مولانا صاحب نے عرض کیا: حضرت! بسا اوقات دنیا والوں کی چیزیں دیکھ کر دل میں کچھ خواہش سی پیدا ہوتی ہے۔

فرمایا: بس اگر گنجائش ہو تو حرج نہیں۔ اگر نہ ہو تو صبر ہے۔ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے خطبات میں فرمایا ہے کہ: مکان چار قسم کے ہیں یا مکان کے چار درجے ہیں:

(۱) رہائش۔

(۲) آسائش۔

(۳) آرائش۔

(۴) نمائش۔

رہائش سے مراد محض گذارا اور سر چھپانے کی جگہ ہے۔ اور آسائش کا درجہ یہ ہے کہ چلو کچھ سہولیات بھی جمع کر لی جائیں۔ اور آرائش یہ ہے کہ چلو کچھ خوبصورتی اور ظاہری رنگ روغن اور باغیچہ اور پھلواڑی وغیرہ بنوا لی۔ اور نمائش یہ ہے کہ فخر و مباہات اور دکھاوے کے جذبے سے بنانا۔

اس میں سے تین درجے [اپنی اپنی حیثیت کے حساب سے] جائز ہیں اور چوتھا ناجائز ہے۔

پھر فرمایا: لیکن ایک عام حضرات کا تقویٰ ہے اور ایک علماء کا تقویٰ ہے۔ علماء کو چاہیے کہ دنیا کی ان چیزوں کی طرف زیادہ دھیان نہ دیں، ان کو اللہ نے جو دولت عطا فرما رکھی ہے، اسی میں لگے رہیں۔

☆......☆......☆......☆

مولانا احسن احمد عبدالشکور، بہاول پور

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد رحمہ اللہ

جامع المحاسن

۱۸ر شوال المکرّم ۱۴۴۰ھ حضرت مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ اور میں دوبارہ یتیم ہو گیا۔ پہلی مرتبہ تب: جب یکم جون ۲۰۰۹ء کو میرے والد صاحب کی وفات کی اطلاع ملی تھی۔ اور دوسری مرتبہ آج......!!! اور دونوں مرتبہ سانس بند ہوتا، اور جان نکلتی محسوس ہوئی۔

محبت کے اپنے ہی پیمانے ہوا کرتے ہیں، محبوب کی ہر ہر اَدا بے مثال اور کمی سے مبرا معلوم ہوا کرتی ہے۔ بندہ کا اِحساس یہ ہے کہ حضرت رحمہ اللہ کو "جامع المحاسن" بھی کہا جائے تو آپ کی شخصیت بڑی، اور اِس جیسے بھاری بھرکم لفظ کا چولا تنگ معلوم ہوتا ہے، معلوم نہیں کہ مجھ جیسے گم نام کوتاہ نظر کو آپ سے کب اور کیسے اتنی شدید محبت ہوگئی۔

جب مفتی عبدالرحمٰن صاحب دامت برکاتہم کا اطلاعی فون آیا کہ: "حضرت ڈاکٹر صاحب وفات پا گئے۔" تو اس اچانک خبر سے دماغ ماؤف سا ہو گیا، کان سائیں سائیں کرنے لگے، اور بھری دنیا اُجڑی اجڑی معلوم ہونے لگی۔ چند ایک ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے جنازے میں اکٹھے چلے جائیں، لیکن کسی سے بھی رابطہ نہ ہو سکا۔ اِسی میں بہتری ہوگی۔ تشویش یہ تھی کہ کہیں جنازے میں شرکت سے محروم نہ رہ جائیں۔ مسنون ہے کہ جنازہ تیار ہو تو اس میں دیر نہ کی جائے، اور جلد سے جلد نماز جنازہ پڑھ کر تدفین کر دی جائے۔ تو جو شخص خود اپنی ساری عمر سنتوں کی پابندی اور اہتمام سے گذار کر گیا ہو، اور جانشین وخلف الرشید بھی ایک نیک صالح عالم ومفتی کی صورت میں موجود ہو، تو اِس سنت پر عمل ہونے کی حوصلہ اَفزا اُمید کے ساتھ ساتھ، خود کے دل میں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں لاہور پہنچنے میں ذرا سی تاخیر ہوگئی تو جنازے میں شرکت سے محروم ہو جاؤں گا۔ خیر ماؤف دماغ کے ساتھ، اکیلا ہی بھاگم بھاگ لاہور کے لیے نکل پڑا۔ سارا راستہ گذرے دنوں کی باتیں یاد آتی رہیں، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی شفقتیں، محبتیں، اور......اور......اور......،

زندگی کے ہر ہر موڑ پر مختلف مسائل میں، ہمہ جہتی پیش آمدہ مشکلات میں، دینی رہنمائی اور مشکل کا حل یوں مل جایا کرتا تھا جیسے اِس مسئلے کا اِس سے زیادہ فطری اور آسان حل کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اور حضرت ڈاکٹر

صاحب رحمہ اللہ کی مجلس میں بیٹھنے، اور اُن کی روحانی توجہات کی برکت سے گتھیاں یوں سلجھتی چلی جاتی تھیں کہ بعض مرتبہ تو خود حیرت ہوا کرتی تھی کہ یہ بات پہلے کیوں ذہن میں نہ آئی، اور ذہن پہلے اِس نکتے کی طرف کیوں منتقل نہیں ہوا۔ خیر، تعلیم وتربیت کے طویل سلسلے میں یہ باتیں تو آئے روز کا معمول ہوتی ہیں۔ سارا راستہ ذہن میں گذرے لمحات کی یادوں کے نقوش ابھرتے مٹتے رہے، اور ہمت کے بقدر کچھ تلاوت و ذکر کرکے ایصالِ ثواب کرتا رہا۔

عشاء کی نماز کے وقت لاہور پہنچا، اُسی مسجد میں نماز پڑھی جہاں بارہا حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے ملنے کے لیے آتے تھے، تو پڑھا کرتے تھے، اور خشوع سے خالی نماز پڑھ کر ایک خشوع وخضوع سے بھری نماز پڑھنے والی شخصیت کا انتظار کیا کرتے تھے۔ سب باتوں کا پتہ ہوتے ہوئے بھی دزدیدہ سی نظروں سے، نمازیوں کی صفوں میں: نماز پڑھتے ہوئے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو نگاہیں تلاش کرتی رہیں، گو کہ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے، اور جو ہونی تھی، وہ ہو چکی تھی۔

نماز جنازہ کا وقت تو کچھ دیر ٹھہر کر تھا، باہر آئے، کچھ ساتھیوں سے ملاقات ہوئی، کہنے کو کسی کے پاس کچھ نہیں تھا، بس بوجھل طبیعت اور بے زبان دل، اور اس آزمائش سے گذرتے لمحات ؎

زبان بے دل ہے، اور دل بے زباں ہے ہائے مجبور
بیاں میں کس طرح آئے کہ جو دل پر گزرتی ہے

بس مفتی عبدالرحمٰن صاحب نے بہ مشکل تمام ایک مختصر سا جملہ کہا جو سب کی دلی ترجمانی تھی کہ: ''آج ہم یتیم ہو گئے''۔ اس قسم کے موقعوں پر اس قسم کے جملے سنتے رہے تھے، لیکن علمی میدان، خصوصاً اِفتاء وارشاد کے میدان میں یتیم ہو جانے کا احساس کس قدر اَذیت ناک ہوتا ہے، اِس کا شعوری تجربہ شاید پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اکابرین کی بروقت قدردانی اور اُن سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اجمالی خاکہ:

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ کی زندگی کا تفصیلی خاکہ لکھنا تو مفتی عبداللہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ، فرزندِ اکبر حضرت ڈاکٹر صاحب کے ذمے ہے، اور وہی لکھ سکتے ہیں، اور علمی جولانیوں کی تفصیلی داستان پر دارالافتاء سے جڑے مفتیانِ کرام میں سے کوئی روشنی ڈال سکتا ہے۔ لیکن میرے جیسا کوتاہ بین شخص اگر خاکہ سازی کی کوشش کرے تو یوں کہہ لیجیے کہ: تقویٰ، طہارت، سنجیدگی، متانت، وقار، شفقت ورافت، فکر ونظر، تحقیق وتدقیق، علمی رسوخ، فقہ الکتاب والسنۃ، اِحقاق حق، اِبطال باطل، تعاقب فتن، معصومیت، سادگی، سلامتی فکر، اور اُصول پسندی جیسی صفات کو متجسد کیا جائے تو اس سے حضرت الاستاذ ڈاکٹر

مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ کی سی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ قلم سیال تھا، اور خوب روانی سے چلتا تھا، مختلف علوم وفنون پر انتہائی قیمتی علمی ورثہ، صدقہ جاریہ کے طور پر چھوڑا ہے۔ اِس تحریری سرمائے کی فہرست بترتیب حروف ابجد درج ذیل ہے:

۱- اسلامی صکوک، تعارف وتحفظات۔

۲- اسلامی عقائد۔

۳- اصول دین۔

۴- بہائی جماعت کی خدمت میں چند گذارشات۔

۵- پاکستان میں رائج کردہ اسلامی بینکنگ میں چند واجب اصلاح امور۔

۶- تجارت کے اسلامی احکام۔

۷- تحفۂ اصلاحی۔

۸- تحفۂ خیر خواہی۔

۹- تحفۂ غامدی۔

۱۰- تین متفقہ مسائل کی تحقیق۔

۱۱- جاگیرداری اور اسلام۔

۱۲- جدید معاشی مسائل کی اسلامائزیشن کا شرعی جائزہ۔

۱۳- جوابِ نفیس۔

۱۴- داستانِ عبرت (حصہ اول، دوم)

۱۵- دین کے کام میں راہنما اصول۔

۱۶- ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار ونظریات کا جائزہ۔

۱۷- سبزی منڈی وفروٹ منڈی کی آڑھت کے اسلامی احکام۔

۱۸- سونا چاندی اور ان کے زیورات کے اسلامی احکام۔

۱۹- شرح احادیث حروف سبعہ اور تاریخ قراءت متواترہ۔

۲۰- صفات متشابہات اور سلفی عقائد۔

۲۱- علوی مالکی کے عقائد۔

۲۲- عمار خان ناصر کا نیا اسلام اور اس کی سرکوبی۔

۲۳-فاضل بریلوی۔

۲۴-فزکس اور میٹا فزکس۔

۲۵-فقہ اسلامی۔

۲۶-فقہی مضامین۔

۲۷-فہم حدیث، شرح الحدیث۔

۲۸-فہم قرآن، تفسیر۔

۲۹-قرآن کو قرآن کے مطابق سمجھیے۔

۳۰-قرآن و حدیث سے عداوت کیوں؟

۳۱-مرزا قادیانی۔

۳۲-مروجہ مجالس ذکر و درود شریف کی شرعی حیثیت۔

۳۳-مریض و معالج کے اسلامی احکام۔

۳۴-مسائل بہشتی زیور۔

۳۵-مسنون حج و عمرہ (مدلل)

۳۶-مسنون حج و عمرہ (مختصر)

۳۷-ہدیۂ فکر۔

۳۸-متفرق مقالہ جات، جو ''انوار مدینہ'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اپنی بساط بھر استیعاب کی کوشش کے باوجود یقیناً کچھ کتابوں کا تذکرہ رہ گیا ہوگا۔ اگر کسی ساتھی کو مزید کتابوں کا علم ہو، تو ضرور خبر کرے۔ اِن کتابوں پر تفصیلی تبصرہ، یا معاصر علماء و مفتیان کرام کی آراء کو تو اِس مختصر سے مضمون میں نقل نہیں کیا جا سکتا، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں اور اُن کے موضوعات کا مختصر سا تعارف کروا دیا جائے، جس سے اندازہ ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے قلم سے کن کن جہتوں سے دین کی خدمت لی ہے۔

قرآنی خدمات:

اسلامی علوم و معارف کی ابتداء قرآن مجید سے ہوتی ہے تو ''فہم قرآن'' نامی تفسیر سے اس کا موضوع روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اور علوم قرآن ہی کے ذیل میں قراءات کے موضوع پر بھی ایک رسالہ موجود ہے۔ اس تفسیر کا کام سولہ پاروں تک حضرت رحمہ اللہ کی زندگی میں کافی عرصہ پہلے مکمل ہو چکا تھا، اور تین

جلدوں میں طبع ہو کر عام دستیاب تھا البتہ سترہویں پارے سے آخر تک کی تفسیر کا موقعہ آخری عمر میں ملا جو بائیسویں پارے تک کا کام مکمل ہو چکا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا (یہ حصہ بھی طبع کے مراحل کے بالکل قریب ہے)۔ آپ کے خلف الرشید حضرت مولانا مفتی عبداللہ صاحب اور آپ کے دیگر تلامذہ سے امید ہے کہ اس کی اسی نہج پر تکمیل فرما دیں گے۔ اس تفسیر میں لفظی ترجمہ، ''تفسیر بیان القرآن'' اور ''تفسیر عثمانی'' اور کہیں کہیں ''معارف القرآن'' سے استفادہ کیا گیا ہے، اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ایک تشریحی تفسیر ہے، جس میں مصنف رحمہ اللہ کی اپنی تحقیقات بھی شامل ہیں۔

پھر قرآن مجید کو سمجھنے کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو متوارث ہے، یعنی اساتذہ سے پڑھ کر ایک خاص اسلامی ذوق کی تعمیر اور پھر متقدمین اور اکابرین کے فہم اور ان کی فراست کے تابع ہو کر چلنا۔ لیکن آج کل پرویزی فکر کے نمائندہ محمد شیخ اور ڈاکٹر قمر الزمان وغیرہ جیسے منکرین حدیث اور ان جیسے بہت سے ایسے لوگ بھی جنہوں نے متوارث طریقے سے دینی علم بھی حاصل نہیں کیا ہوا، اور فہم قرآن و حدیث کے لیے مطلوبہ مقدار میں علم بھی حاصل نہیں کیا ہوا، اور طرفہ تماشا ہے کہ قرآن مجید سمجھنے کی خانہ زاد کوشش میں علماء کے منہ کو آتے ہیں کہ علماء بھی قرآن مجید کو اس طرح کیوں نہیں سمجھتے جس طرح ہمیں سمجھ میں آ رہا ہے، اور عوام کو اپنی چرب زبانی سے بھٹکانے کا کام کرتے ہیں، تو ان جیسے لوگوں کی اصلاح کے لیے استاد جی نے ایک رسالہ بنام ''قرآن کو قرآن کو کہے کے مطابق سمجھیے'' تحریر فرمایا، جو ایک دعوتی کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اور علوم قرآن مجید ہی میں قراءات و روایات کا علم بھی داخل ہے، اور قرآن مجید کی مختلف قراءات ہیں، اور مختلف روایات ہیں اور اتنی بات بہت سوں کو معلوم ہے، (گو افسوس ہوتا ہے کہ اَب ان متواتر روایات کا بھی جاوید غامدی اور ان کے ہم نوا لوگوں نے انکار شروع کر دیا ہے) لیکن فی نفسہ اس موضوع پر یہ سوال کہ حروفِ سبعہ کی روایات کا مفہوم و مطلب کیا ہے، اور اس سے کیا مراد ہے؟ ایک شہرۂ آفاق بحث ہے، اور علوم قرآن کی مشکل ابحاث میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے اس رسالے میں حروف سبعہ کے بارے میں وارد احادیث کی بڑی نفیس اور قیمتی شرح کی ہے، اور قراءات متواترہ کی تاریخ کو بھی اختصار سے بیان فرمایا ہے۔ اور اس طرح کے مشکل مباحث میں حضرت رحمہ اللہ کے قلم کے جوہر خوب کھلے ہیں، اور آپ کے قلم کی جولانی خوب لائق ملاحظہ ہے۔ چنانچہ حروف سبعہ کی شرح میں ایسے دُرَر و جواہر لٹائے ہیں کہ متقدمین کی کتب میں بھی وہ توجیہات اور نکات نہیں جو یہاں ملتے ہیں۔ اور فقہ الحدیث کا یہی وہ میدان ہے جہاں بڑے بڑے متقدمین کے پائے کی توجیہات میں علمائے اہل سنت دیوبند بھی شریک و سہیم ہیں۔

وذلک فضل الله يؤتيه من يشاء.

حدیث پر کام

قرآن مجید کے بعد دوسرا نمبر حدیث وسنت کا ہے۔ اس موضوع پر ''فہم حدیث'' نامی کتاب تین جلدوں میں مرتب فرمائی کہ کتاب اللہ کا صحیح مفہوم حدیث کی مدد سے ہی متعین کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب عقائد، اصول شریعت، عبادات، معاشرت اور معاملات وغیرہ جیسے تمام ابواب پر مشتمل احادیث کا ایک جامع، مفید اور علمی انتخاب ہے، جس میں احادیث کے ترجمے کے ساتھ بین القوسین تشریحی اضافے اور عنوانات بھی قائم کر دیے گئے ہیں۔

اسلامی عقائد

دین اسلام جس کی بنیاد کتاب وسنت پر قائم ہے، اس کی حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تقسیم کے مطابق پہلی اساس ''عقائد'' ہے۔ تو حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے ''اسلامی عقائد'' کے نام سے عقیدے کے قدیم وجدید مباحث کو عصر حاضر کی زبان میں بہت احسن انداز میں ترتیب دیا ہے، اور اسلامی عقائد پر وارد کیے جانے والے اعتراضات کا جواب اِس انداز میں دیا ہے کہ انہیں باقاعدہ سوال، جواب، اشکال اور اس کا حل کا عنوان دے کر ذکر نہیں کیا، بلکہ تسلسل سے اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اگر کوئی اسے کسی استاد سے اچھے انداز سے محنت کر کے پڑھ لے تو معاصر شکوک وشبہات کا شکار نہ ہوگا۔

اُصول دین

پھر کتاب وسنت پر عملی مسائل کے استنباط واستدلال کا مرحلہ بھی درپیش ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ میدان اس فن کے ماہرین کا ہے لیکن آج کے دور میں سطحی سی معلومات کی بنیاد پر شکوک وشبہات کے شکار لوگوں کی کثرت ہے، اور رسوخ تو دور کی بات ہے، موضوع کا تعارف بھی نہیں ہوتا، اور اعتماد کی عادت رہی نہیں، لہٰذا باطل فرقوں کا آسان شکار ثابت ہوتے ہیں۔ تو اُستاد جی نے ''اُصول دین'' کے نام سے ایک کتابچہ اِسی بیماری کے تریاق کے طور پر لکھا ہے، چنانچہ اس کتاب میں وحی، اصول تفسیر، اصول حدیث، سنت، اجماع، قیاس، سنت وبدعت کے اصول، اور ایمان وکفر کے اصول، اور اس جیسے اہم اور بنیادی اصولی مسائل کو آسان تفہیم اور دل نشین تعبیر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

فقہی تالیفات

کتاب وسنت کے نچوڑ اور حاصل کا نام ''فقہ'' ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے ''مسائل بہشتی زیور'' اور ''فقہ اسلامی'' (مناکحات: جو طبع ہو چکی ہے اور حصہ معاملات: جو عنقریب طبع ہونے والی ہے) نامی کتابیں لکھیں۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں مختلف رسائل ومضامین بھی سامنے آتے

رہے، جنہیں نظر ثانی کے بعد ''فقہی مضامین'' کے نام سے علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا۔

o ''مسائل بہشتی زیور'' میں طہارت کے ابواب سے لے کر میراث تک کے تمام ابواب کے جزوی مسائل اور فروعات مذکور ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جدید مسائل بھی کتاب کا جزو ہیں۔

o اور ''فقہ اسلامی'' (حصہ مناکحات) میں مناکحات کے ابواب پر فقہی مسائل دو خصوصیات کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں۔ (۱) مسائل کی فقہی تخریج اور حوالہ جات درج ہیں۔ (۲) مناکحات کے موضوع پر مصنف رحمہ اللہ کے تحقیقی مضامین بھی کتاب میں شامل ہیں۔

o ''فقہی مضامین'' ایک نادر تحقیقی کتاب ہے جس میں مختلف اوقات میں حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے قلم سے نکلنے والے اکتالیس (۴۱) فقہی تحقیقی مضامین شامل ہیں، جو مصنف رحمہ اللہ کی فقہی بصیرت، دقتِ نظر اور تحقیقی ذوق کے آئینہ دار ہیں۔

جس طرح تخصص کے ابتدائی طالب علموں کے لیے ان کتب کا مطالعہ خاص طور پر بہت مفید ہے، اسی طرح مفتیان کرام کے لیے بھی بہت مفید ہے۔

اس کے علاوہ بعض وہ رسائل جو عبادات سے متعلق ہیں، ان میں ''مسنون حج وعمرہ'' (مدلل) اور ''مسنون حج وعمرہ'' (مختصر جیبی سائز) بھی مرتب کیے ہیں، جو: ہر عمرہ اور حج کرنے والے کے لیے ساتھ رکھنا بہت فائدہ مند ہیں۔ خصوصیت یہ ہے کہ حج وعمرہ کے جدید وقدیم مسائل اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ ساتھ ہی قرآن وسنت کے دلائل بھی مذکور ہیں، جن کی ضرورت ہر عالم وعامی کو حرمین شریفین میں بطور خاص پیش آتی ہے۔

اس کے بعد عام زندگی میں پیش آنے والے معاشی ومعاشرتی مسائل پر درج ذیل رسائل آپ کے قلم سے سامنے آئے، جو امت کے کئی ایک طبقات کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے:

o ''مریض ومعالج کے اسلامی احکام'': اس کتاب میں مریض ومعالج سے متعلقہ طبی فقہی مسائل درج کیے گئے ہیں۔ چونکہ مصنف رحمہ اللہ خود ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے، اس لیے اس موضوع کا حق اَدا کیا ہے، اور بہت سے مفید عنوانات کے تحت کام اِس کتاب میں موجود ہے۔

o فزکس اور میٹا فزکس: یعنی طبعیات اور مابعد الطبعیات کے نام سے یہ مختصر کتابچہ اِس بات سے بحث کرتا ہے کہ مسببات کے اسباب حسی اور روحانی دونوں طرح ہو سکتے ہیں۔ ایک کی نفی سے دوسرے کی نفی ضروری نہیں اسی طرح ایک کے اثبات سے بھی دوسری کی نفی ضروری نہیں۔

o تجارت کے اسلامی احکام: اس کتاب میں ایک تاجر کی ضرورت کے شرعی مسائل اور ان سے متعلقہ

نصوص بھی ذکر کی گئی ہیں۔

o سبزی منڈی و فروٹ منڈی کی آڑھت کے اسلامی احکام: اس کتاب سے اہل علم کے سامنے بازار کے بہت سے مسائل اور ان کا حل آ جاتا ہے۔

o سونا چاندی اور ان کے زیورات کے اسلامی احکام: اس میں سونے چاندی کے بازاروں سے معلومات کے حصول کے بعد، ان مسائل کا شرعی حل مذکور ہے، اور صراف و زرگر حضرات کے بہت سے بنیادی سوالوں کے جوابات بھی درج کر دیے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ انفرادی اور اجتماعی طور پر بعض دینی کام کرنے والوں کی اصلاح و ارشاد کے لیے کچھ مضامین لکھے، جنہیں ''دین کا کام کرنے والوں کے لئے چند رہنما اصول'' کے نام سے ایک رسالے کی شکل میں شائع بھی کر دیا گیا، چنانچہ اس کتاب میں معاصر عملی تحریکوں، علمی اداروں اور افراد کے ہاں پائے جانے والے بعض انحرافات اور کچھ علمی فروگذاشتوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ صحیح رہنمائی بھی کر دی گئی ہے۔ ہر صاحب علم کے مطالعے سے گذرنے کے لائق ہے۔

تنقیدی تحریرات

پڑھنے والے کے سامنے واضح ہو گیا ہو گا کہ بہ حیثیت ایک عالم اور مفتی کے، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی زندگی کا اصل مقصد امت کے مختلف طبقوں کی ''صحیح دینی رہنمائی'' ہی تھا۔ اور اب تک کی ذکر کردہ تمام تصنیفات اس کا واضح ثبوت ہیں۔ اور جس شخص نے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی تصنیفات کو دیکھ رکھا ہے اس پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ مذکورہ بالا کتب اچھی بھلی ضخامت کی ہیں، گویا حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا اصلی میدان فقہ اسلامی ہی تھا، جہاں ان کی صلاحیتیں اپنی جولانیاں دکھاتی تھیں۔ اِس کے برعکس جو کتب و رسائل: مختلف گمراہ یا بے اعتدال حضرات کے رد اور تعاقب میں لکھے گئے ہیں اُن کی ضخامت بہت ہی کم ہے، اور ایک موقعے پر استاد جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں ''عمار خان ناصر کا نیا اسلام اور اس کی سرکوبی'' کا کام چل رہا تھا، تو فرمانے لگے: ''ہم نے تو اپنی ...... (فلاں کتاب) کے بعد فل سٹاپ لگا دیا تھا، خیال تھا کہ اَب کسی کی تردید میں کچھ نہیں لکھیں گے، لیکن بعض حضرات مجبور ہی کر دیتے ہیں۔'' اِس سے صاف ظاہر ہے کہ کسی کے رد یا تعاقب میں کچھ لکھنا ان کا محبوب موضوع نہیں تھا، بلکہ مجبوری سے لکھتے تھے۔ خیر ذیل میں ان کتابوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، جن میں کسی باطل یا گمراہ کا رد کیا گیا ہے:

o مرزا قادیانی: یہ مضمون ایک صاحب کی فرمائش پر لکھا تھا۔

o بہائی جماعت کی خدمت میں چند گزارشات۔

o فاضل بریلوی میں مولانا احمد رضا خان بریلوی صاحب کی شخصیت اور بعض افکار و آراء کا تعارف کروایا گیا ہے۔

o عمار خان کا نیا اسلام اور اس کو سرکوبی: مولانا زاہد الراشدی صاحب کے صاحبزادے اور جاوید احمد غامدی کے شاگرد: عمار خان ناصر نے کئی ایک مسائل جیسے حدود و تعزیرات، اجماع امت، مسجد اقصیٰ کی تولیت، ناموس رسالت، اور جہاد کی تعبیر میں جمہور امت کی متوارث فکر و سوچ سے ہٹ کر گمراہ کن اور غلط تعبیرات اختیار کر لیں، اور اپنے خانوادے کے علمی پس منظر کی وجہ سے ایک سادہ لوح طبقے پر اثر انداز ہونا بھی شروع کر دیا۔ تو حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے اس کتاب میں ان غلط نظریات کا بھرپور مدلل رد کیا ہے۔

o ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار و نظریات کا جائزہ: امین احسن اصلاحی کے ایک مسترشد ڈاکٹر اسرار احمد کے فکر اور حلقے میں پائی جانے والی چند اہم بنیادی اور سنگین نوعیت کی غلطیوں بلکہ گمراہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے تنقید کی ہے، جس کی تعریف مولانا عبد الرشید نعمانی صاحب رحمہ اللہ نے بھی فرمائی بلکہ اس سے استفادہ بھی فرمایا۔

o تحفۂ اصلاحی: جس میں جناب امین احسن اصلاحی صاحب کی کتابوں ''مبادیٔ تدبر قرآن'' اور ''مبادیٔ تدبر حدیث'' پر تبصرہ و تحقیق ہے، جس میں امین اصلاحی صاحب کے اصول تفسیر، اور فہم حدیث پر عالمانہ گرفت، اور ان کے گمراہ کن اصولوں پر مضبوط استدلال اور باحوالہ ابحاث کے ساتھ کڑی تنقید کی ہے۔

o تحفۂ خیر خواہی: اس کتابچے میں کیپٹن مسعود الدین عثمانی کے گمراہ کن نظریات اور مغالطات کا جائزہ لے کر غلط استدلالات کا جواب دیا گیا ہے۔

o تحفۂ غامدی: جس میں مشہور ٹی وی مہمان، متجدد، منکر حدیث اور جمہور امت کی فکر سے منحرف جاوید احمد غامدی صاحب کے اصولی مغالطات و نظریات کی نشان دہی، ان کا عام فہم علمی جائزہ لیتے ہوئے تنقید کی گئی ہے، جس کا جواب تا حال اس حلقے سے نہیں بن سکا۔

o قرآن و حدیث سے عداوت کیوں؟: جس میں منکر حدیث ڈاکٹر قمر الزمان کے افکار کا محاسبہ کر کے اشکالات کا جواب دیا گیا ہے۔

o جاگیرداری اور اسلام: جس میں مولانا طاسین صاحب کے مضمون پر تبصرہ ہے، اور ان کے بعض مغالطوں کا جواب دیا گیا ہے۔

o علوی مالکی کے عقائد: عالم عرب کے ایک بدعتی عالم شیخ محمد بن علوی مالکی کی دو عربی کتابوں

’’الذخائر المحمدیۃ‘‘ اور ’’مفاھیم یجب أن تصحح‘‘ اور اس کے اردو ترجمے: ’’اصلاح مفاہیم‘‘ میں ذکر کردہ بدعات اور غلط عقائد کا علمی جائزہ لے کر تنقید کی گئی ہے۔

o داستانِ عبرت: اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے آپ نے مولانا عبدالحفیظ صاحب (مکہ مکرمہ)، صوفی اقبال صاحب (مدینہ منورہ)، حافظ صغیر صاحب (لاہور) اور مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی صاحب (راولپنڈی) کے بعض تسامحات وتساہلات اور ایک عرب بدعتی عالم علوی مالکی کے نظریات کی ترویج کے خلاف ایک ناصحانہ کتابچہ تحریر فرمایا۔ پھر اسی سلسلے کی دوسری کڑی کے طور پر اسی عرب بدعتی عالم محمد بن علوی مالکی کی کتاب کے ترجمہ ’’اصلاح مفاہیم‘‘ پر علمی تبصرہ بھی کیا، اور مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی صاحب کی کتاب ’’اکابر کا مسلک ومشرب‘‘ پر ناصحانہ تبصرہ بھی کیا۔

o جوابِ نفیس: حافظ ظفر اللہ شفیق صاحب کی جانب سے واقعہ کربلا اور اس سے جڑے بعض افکار و نظریات میں پائے جانے والے افراط وتفریط اور غلو پر مبنی موقف کی اصلاح کے لیے یہ کتاب لکھی گئی، اور ساتھ ہی حضرت سید نفیس الحسینی شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے صحیح موقف کا دفاع بھی کیا گیا ہے۔

o ہدیۂ فکر: تنظیم فکر ولی اللہی مولانا عبیداللہ سندھی کی تفسیر سے چند فروگذاشتوں کی نشاندہی پر مشتمل کتابچہ ہے۔

یہ فہرست ان رسائل اور کتابچوں کی ہے جو اختلافی اور تردیدی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ اور جس نے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے تحریری ذخیرے کو دیکھ رکھا ہے اسے خوب اچھی طرح معلوم ہوگا کہ تردیدی موضوعات پر ان کی لکھی گئی کتب ورسائل کی مقدار، مجموعی طور پر مثبت اور تعمیری کیے ہوئے کام کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

تحقیقی تالیفات

اس کے علاوہ استاد جی کے علمی کام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے علمی اختلاف اور تحقیقی اختلاف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی کتابیں تردید یا تعاقب پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ، انتہائی علمی اور تحقیقی ہیں۔ ذیل میں ان کتب کا مختصر سا تذکرہ کیا جاتا ہے:

سب سے پہلے ’’صفات متشابہات اور سلفی عقائد‘‘ نامی کتاب ہے۔ اس کتاب میں حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے انتہائی عرق ریزی سے شیخ ابن عثیمین اور سلفیہ کے معتبر ومعروف علماء وغیرہ کی تصریحات اور واضح تعبیرات کی روشنی میں بحث کی، اور بحث کو نتائج تک پہنچا کر چھوڑا، اور پھر سلفیہ کی ان غلط تعبیرات کا علمی اور ناقدانہ جائزہ لیا، جس میں عالمانہ اسلوب اور فقیہانہ زبان کی چاشنی بھی شامل ہے، جنہوں

نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے، انہیں اس عرق ریزی کا خوب اندازہ ہوگا۔ اور میں نے چونکہ اس کتاب کی تعریب بھی کی تھی جس کا ذکر آگے آتا ہے، اس لیے علیٰ وجہ البصیرت اس کی قیمتی ابحاث کی اطلاع ہے۔ بعد میں حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے اس تفصیلی کتاب کا ایک خلاصہ بھی تیار کیا تھا، جو عدیم الفرصت عوام و طلبہ کے لیے کافی مفید ہے۔

اس کے علاوہ جدید معیشت و تجارت آج کے زمانے کا ایک حساس موضوع ہے۔ حضرت استاذ مکرم مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کو اس باب میں گویا سبقت حاصل ہے، اور انہوں نے اس کے بارے میں بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے، اور اس بارے میں ان کی کئی تحریرات اور فتاویٰ بھی ہیں۔ بینکاری اور بیمہ وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن سے عموماً علماء کرام کو عمر بھر پالا نہیں پڑتا۔ اب حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی تحقیقات نے ان موضوعات پر غور و فکر کا ایک باب کھول دیا، اور اسلامی بینکاری اور تکافل جیسے متبادل طریقہ کار سے تعارف مفتیان کرام کے لیے گویا ضروری ہوگیا۔ چنانچہ ان مسائل کے تنقیدی جائزے، اس پر تبصرے اور اگر کہیں اختلاف ہو تو اسے ظاہر کرنے کا حق یقیناً حضرت ڈاکٹر عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ جیسی شخصیات ہی کو حاصل تھا، ہم جیسے تو اگر ڈھنگ سے خوشہ چینی کر سکیں تو بھی بہت کافی ہے۔ تو تردید و تنقید کے میدان میں حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی تحریرات کا ایک معتدبہ حصہ ان موضوعات پر مشتمل ہے اور جو کتب اس وقت میرے سامنے آسکیں وہ درج ذیل ہیں:

o **جدید معاشی مسائل کی اسلامائزیشن کا شرعی جائزہ:** اس کتاب میں اسلامی بینکاری کے واجب الاصلاح امور، کریڈٹ کارڈ، تجارتی انعامی اسکیمیں، تکافل، شیئرز، کمپنیوں کی شرعی حیثیت جیسے معاشی مسائل کا فقہی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

o **اسلامی صکوک، تعارف و تحفظات:** اب اسلامی معیشت میں اسلامی صکوک نامی اصطلاح اجنبی نہیں رہی۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے صکوک کے تعارف کے بعد، بعض اہل علم کی جانب سے ان کے پیش کردہ فقہی احکام و مسائل کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔

o **پاکستان میں رائج کردہ اسلامی بینکنگ کے چند واجب اصلاح امور۔**



میں حضرت الاستاذ ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں تو تخصص فی الحدیث کے بھی بعد پہنچا ہوں۔ تعارف کی سرگزشت یہ ہے کہ میں نے درسِ نظامی کا اکثر حصہ مدرسہ عربیہ رائیونڈ تبلیغی مرکز (اور اس کی شاخ) میں پڑھا۔ ہمارے ایک ساتھی محمد شاکر لاہوری (جو ماشاءاللہ اب مفتی شاکر صاحب کے

نام سے معروف ہیں)، بہت ہی رکھ رکھاؤ والے اور نستعلیق سے مزاج کے تھے۔ ان سے دوستی ہوئی، تو گاہے گاہے ان کے والد صاحب کی زیارت کا موقع بھی ملتا رہا۔ پہلی مرتبہ حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ کا نام انہی کی زبانی سنا۔ جامعہ مدنیہ (قدیم) کریم پارک کے اکابرین سے اُن کا دیرینہ تعلق تھا۔ مولانا رشید میاں صاحب اور دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے بھی نیاز مندی کا تعلق تھا۔ اُن کا اِرادہ تھا کہ دورۂ حدیث کرنے کے بعد بیٹے کو تخصص کروائیں، چنانچہ شاکر بھائی کو، دوران درس نظامی ہی حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں لے گئے تاکہ کچھ مناسبت پیدا ہو جائے۔ شاکر بھائی نے اس مجلس کی کارگزاری بھی سنائی تھی جو پوری طرح یاد بھی نہیں رہی اور ساتھ کچھ کتابیں بھی دکھائیں جو حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ کی لکھی ہوئی تھیں۔ اور یہی میرا استاد جی سے پہلا تعارف تھا۔

مدرسہ عربیہ تبلیغی مرکز رائے ونڈ میں جن اساتذہ سے مختلف فنون وعلوم کی کتب پڑھیں، اُن میں مولوی آفتاب صاحب رحمہ اللہ بھی تھے۔ علم میراث کی شامل نصاب واحد کتاب ''سراجی'' انہی سے پڑھی۔ وہ حساب کتاب کے ماہر اور یکتائے روزگار قسم کی شخصیت تھے۔ اُن سے مناسبت بڑھی تو معلوم ہوا کہ استاد جی ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ یہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا دوسرا تعارف تھا۔ اِس سے اتنا ہوا کہ کسی اجنبی شخصیت سے جو طبعی بے گانگی ہوا کرتی ہے اُس میں کسی قدر کمی آ گئی، لیکن تعارف ہنوز سرسری سا ہی رہا۔

اللہ کا کرنا کہ دورانِ تعلیم ہی مولوی آفتاب صاحب کی وفات کا اندوہناک قصہ پیش آیا اور بہت خواہش کے باوجود مدرسے کے نظم کا پابند ہونے کی وجہ سے استاد جی کے جنازے میں شرکت نہ کر سکا۔ اس وقت کی اتنی بات البتہ یاد ہے کہ مولانا جمشید صاحب صدر مدرس مدرسہ عربیہ رائے ونڈ، مرکز کی جانب سے جنازے میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اور تبلیغی معمول کے مطابق انہوں نے مجمع اکٹھا ہونے کی بناء پر موقعہ کی مناسبت سے بیان فرمایا، اور تبلیغی طرز سے تشکیل بھی کی۔ اسی میں کافی دیر لگ گئی اور ہمیں سننے کو ملا کہ مولوی آفتاب صاحب کے بھائی حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالوحد صاحب رحمہ اللہ جنازہ تیار ہونے کے باوجود تاخیر ہو جانے پر کچھ ناراض بھی ہوئے، اور شاید اس موقعے پر کچھ ارشاد بھی فرمایا، جس کی مختصر سی کارگذاری سن کر میرے جیسے طالب علم کے کچے ذہن نے مولانا جمشید صاحب اور حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی غائبانہ شخصیت کا آپس میں تقابل کر کے، رجحان کا فیصلہ حضرت مولانا جمشید صاحب کے پلڑے میں ڈالا، اور حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں کوئی مثبت خاکہ نہ پایا۔ کیا خبر تھی کہ آگے چل کر یہ خاکہ اس کے بالکل برعکس ایک ایسی شخصیت کا کوہ ہمالیہ ثابت ہوگا جس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کو

’’حاصل زندگی‘‘ کہا جائے تو بجا ہے۔

سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ: کسی شخصیت کی تصویر کشی کے لیے الفاظ کا جامہ بہت ناکافی ہوا کرتا ہے اور یہ لفظی جامہ کبھی تو بہت ہی ڈھیلا رہ جاتا ہے اور کبھی بہت ہی تنگ۔ صحیح تعارف کی ایک ہی صورت ہے کہ ملاقات کی جائے اور سر کی آنکھوں سے بالمشافہ زیارت کی جائے۔

مفتی شاکر صاحب نے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے چند ایک رسائل جو اس وقت دکھائے تھے، انہیں دیکھ کر ذہن میں جو تاثر قائم ہوا، کچھ یوں تھا کہ: ان کتابوں کے مصنف کوئی حضرت ڈاکٹر صاحب ہیں جو مفتی صاحب بھی بن گئے ہیں، اور ان کے مزاج میں سختی بہت زیادہ ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ جتنے بھی رسالے دیکھنے کو ملے تقریباً سب ہی کسی نہ کسی کے نظریات کی تردید، یا کچھ بے اعتدالیوں کی نشان دہی پر مشتمل تھے، اور ہم ان دنوں دعوت و تبلیغ کے نہج پر صرف مثبت طریقے سے کام کرنے کے انداز پر عمل پیرا تھے۔ اور پھر اسی تاثر کو استاد جی کے جنازے کی خبر نے اور پکا کر دیا۔

خیر! مجموعی تاثر یہ رہا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ بہت سخت اور درشت مزاج آدمی ہیں۔ اور جلتی پر تیل کا کام اس بات نے کیا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا تبلیغ میں وقت بھی نہیں لگا ہوا۔ اس کے علاوہ کچھ خبر نہیں تھی کہ کون ہیں؟ کہاں سے پڑھے ہیں؟ کن اکابر سے علم حاصل کیا ہے؟ بیعت کا تعلق کن سے ہے؟ اور کن کن ہستیوں سے فیض حاصل کیا ہے؟ کیا عمر ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں تو بعد میں پتہ چلیں اور آہستہ آہستہ آشکارا ہوا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کون ہیں، اور ان کا علمی قد کاٹھ کتنا بلند و بالا ہے۔

ہم نے دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد تخصص فی الحدیث کے لیے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ یوسف بنوری ٹاؤن کراچی کا رخت سفر باندھا، اور مولوی شاکر صاحب نے سال لگا کر حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب کے ہاں تخصص فی الفقہ میں داخلہ لیا۔ اب گاہے ماہے حضرت ڈاکٹر صاحب کا نام کانوں میں پڑنے لگا، اور کچھ علمی و تحقیقی ابحاث میں ان کی وزنی وزنی آراء کا پتہ چلنا شروع ہوا، اور ایک تصوراتی خاکہ جو اَبھی بھی بہت حد تک دھندلا ہی تھا، کچھ کچھ واضح ہونے لگا۔

تخصص فی الحدیث کے دوسرے سال کے دوران کسی کام کے سلسلے میں لاہور آنا ہوا۔ اُن دنوں اِرادہ تھا کہ تخصص فی الحدیث سے فراغت کے بعد تخصص فی الفقہ الاسلامی میں داخلہ لوں گا۔ سو پیش بندی کے طور پر مناسبت پیدا کرنے کے لیے جامعہ دارالتقویٰ حاضر ہوا۔ مفتی شاکر صاحب ان دنوں تخصص کے طالب علم تھے، اُن سے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں پوچھا۔ اُنھوں نے کیا کچھ بتایا، یاد نہیں رہا لیکن یہ بھی بتایا کہ اَبھی تھوڑی دیر میں سبق پڑھانے کے لیے تشریف لائیں گے، اور یہ ممکن ہے کہ میں بھی سبق میں

شریک ہو جاؤں۔ میری تو عید ہوگئی۔ وہیں دارالافتاء میں ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر میں استاد جی تشریف لائے۔ اچھی طرح یاد ہے کہ پینٹ کوٹ میں ملبوس کوئی ادھیڑ عمر کے ایک صاحب اختلافی موضوع پر کوئی تحریر لائے ہوئے تھے، اور مُصِر تھے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب اُن کے موقف کی تائید کر دیں۔ اور حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اُن کی تردید فرما رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ گفتگو چلتی رہی، اور حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے اُن کی بات کی مکمل تردید بھی کی اور جو دلائل اُنہوں نے ذکر کیے، مختصر انداز میں اُن کے جوابات بھی دیے، اور وہ صاحب مزید غور و فکر کرنے کا کہہ کر چلے گئے۔

اس سارے دورانیے میں میرے دل میں یہی دھڑکا لگا رہا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب اَب غصے ہوئے کہ تب غصے ہوئے، مگر مجال ہے کہ بالکل ہی سطحی معلومات والے شخص سے گفتگو کرتے ہوئے پیشانی ذرا بھی شکن آلود ہوئی ہو۔ میں اپنے سابقہ خاکے اور آنکھوں دیکھی کا موازنہ کرتا رہ گیا کہ سوچ کیا رہا تھا اور حقیقت کیا ہے!! بعد میں بہت سے علماء اور طلباء سے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں اس طرح کے لاعلمی پر مبنی مگر ''محکم'' تبصرے سننے کو ملتے رہے، اور میں وضاحتی دفاع کے ساتھ اسے برداشت بھی کرتا رہا کہ جس کیفیت سے وہ ابھی گذر رہے تھے، میں برسوں پہلے گذر چکا ہوں۔

خیر! جس طرح کی مجلس کی گفتگو اَبھی دیکھی تھی، اس کے بعد طبیعت کا مکدر ہو جانا بھی طبعی ہے۔ خیال تھا کہ سبق کی ابتداء ہی میں ایک صاحب کا اِس طرح معمول میں مخل ہونا تکدر کا باعث ہوا ہوگا جو سبق کے ماحول پر اثر انداز ہوگا، اور سبق میں وہ بشاشت نہیں ہوگی، لیکن وہاں سکون و متانت اور رعب و وقار کے ساتھ ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی اور معمول کے مطابق سبق۔

اسی موقعے پر شاکر بھائی نے میرا تعارف کروا دیا کہ رائے ونڈ میں اکٹھے پڑھے ہوئے ہیں، اور اَب تخصص فی الحدیث میں ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی صاحب کے پاس ہیں، تو پھر تو حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی طبیعت گویا اور بھی ہشاش بشاش ہوگئی۔ کچھ حدیث کی، کچھ فقہ کی، اور کچھ فقہ الحدیث کی باتیں پوچھتے رہے، اور میں بھی اپنی بساط کے مطابق کچھ جواب دیتا رہا، اور بعض چیزوں کے بارے میں سوال کرتا رہا، اور حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ جواب اِرشاد فرماتے رہے۔

اس کے بعد بھی کئی مرتبہ اسباق میں حاضر ہونے کا موقع ملا، اور مختلف موضوعات پر استفادہ کرتا رہا، لیکن جس جس موضوع پر مطالعہ کر کے جزئیات دیکھ کر، نصوص تلاش کر کے حاضر ہوا، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو کسی جزئیے سے بے خبر نہیں پایا۔ اور جس مقام پر میں تھک کر بیٹھ چکا ہوتا تھا، استاد جی وہیں کھڑا کر کے رواں کر دیتے تھے۔ تخصص فی الحدیث سے فراغت کے بعد میرے گیارہ سالہ علمی سفر کے مسلسل رفیق

مفتی عبدالرحمٰن صاحب نے تو تخصص فی الفقہ میں حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے ہاں با قاعدہ داخلہ لے لیا اور میں سیرت کے ایک نادر مخطوط "**الزّهرُ البَاسِم فی سِيَر أَبِيْ القَاسِم** ﷺ **لمُغلطای بن قِلِيْج**" (متوفیٰ:۷۶۲ھ) کی تحقیق میں مشغول ہو گیا اور با قاعدہ داخلہ نہیں لے سکا، لیکن جب بھی لاہور آنا ہوا، اسباق میں حاضر ہوتا رہا، اور بہت ہی محدود سہی لیکن استفادہ کرتا رہا۔ اور استاد جی کی وسعت ظرفی کہ میرے تخصص فی الافتاء والے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ جانے میں کبھی اجنبی ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بلکہ بارہا کا قصہ یاد آتا ہے کہ درس گاہ میں تشریف لا کر اپنی مسند پر تشریف فرما ہوتے، ایک نگاہ طلباء پر ڈالتے، مجھ پر نظر پڑتی تو مسکرا کر فرماتے: اچھا تو آج مولوی صاحب بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔

یونہی جزوی سے استفادے میں جن کتابوں کے دروس میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، ان کے نام یہ ہیں:

- **رد المحتار الی الدر المختار، لمحمد امین ابن عابدین الشامی**
- **حجة الله البالغه للشاہ ولی الله الدهلوی**
- **مسلم الثبوت للبهاری**
- **الموافقات للشاطبی**

میں کہنے کی تو جرأت بھی نہیں کر سکتا کہ میں نے یہ کتابیں استاد جی سے پڑھی ہیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ان کتب کے بعض اسباق میں بطور طالب علم حاضر ہونے کی سعادت ضرور نصیب ہوئی ہے۔ **و للّٰه الحَمدُ و الشُّكر**

میں خود چونکہ اس کیفیت سے گذر چکا ہوں کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں یہ تأثر رہا کہ انتہائی سخت گیر اور درشت مزاج ہوں گے جس کی وجہ شاید یہ رہی کہ ان کے تحریری سرمائے کا ایک بڑا حصہ ابطال باطل پر مشتمل ہے، جو کہ لابدی طور پر احقاقِ حق کو مستلزم ہے۔ مختلف قسم کی شخصیات اور جماعتوں کی فکری بے اعتدالیوں کا تعاقب، اور بعض نامور حضرات کی علمی فروگذاشتوں پر تنبیہ، اور بعض فتاویٰ جات میں تحقیقی اختلاف، ان سب میدانوں میں آپ کے قلم نے جولانیاں دکھائی ہیں۔ اور احقاقِ حق اور ابطال باطل میں بعض لوگوں کا مزاج عموماً اس قسم کا بن جایا کرتا ہے کہ: اپنے موقف اور اپنے ہم نوا لوگوں کی خواہی نخواہی تائید اور مقابل خواہ کتنی ہی ٹھکانے کی بات کہے، اس کی مخالفت اور بس مخالفت۔ اس لیے بعض دوستوں کے ذہن میں حضرت ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بھی ایسا ہی تأثر قائم ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے آپ کے قریب بیٹھنے اور آپ کو قریب سے دیکھنے سننے کا موقع ملا، اس کے بعد پوری دیانت داری سے عرض کرتا ہوں

کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے ہاں بے جا طور پر نہ مخالفت تھی نہ موافقت، دینی تقاضا ہوا تو ایجابی انداز میں لکھا اور دینی تقاضا ہوا تو سلبی انداز میں لکھا، نہ بے جا طرف داری، نہ بے جا مخالفت۔ اور اس کا تجربہ مجھے ذاتی طور پر بھی ہوا، اور چند ساتھیوں نے بھی اس کی شہادت دی۔

چنانچہ عزیز مکرم جناب مفتی محمد راشد ڈسکوی صاحب جو جامعہ فاروقیہ کراچی میں مدرس اور رفیق شعبہ تصنیف وتالیف رہے ہیں، انہوں نے تخصص فی الفقہ الاسلامی سال دوم میں ''مروجہ تکافل کا فقہی جائزہ'' نامی مقالے کے سلسلے میں ملک بھر کے طول وعرض میں پھیلے مفتیان کرام تک رسائی کی ممکن حد تک کوشش کی، جس کا تذکرہ انہوں نے مقدمے میں کر دیا ہے۔ اسی سلسلے میں ان کی ملاقات حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ سے بھی ہوئی جس کا مختصر تذکرہ انہوں نے بایں الفاظ کیا ہے:

''اس کے بعد لاہور میں دارالافتاء والتحقیق کے رئیس جناب ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب زید مجدہ سے ملاقات کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آنے کا مدعا سامنے رکھنے پر حضرت نے تکافل پر اب تک کا کیا ہوا اپنا کام، اس پر دارالعلوم کی طرف سے دیے جانے والے جواب، اور اس کے جواب میں حضرت ڈاکٹر صاحب کا جواب الجواب، ساری خط وکتابت کی کاپی میرے سپرد کی، اور دعا دیتے ہوئے فرمایا: ''غیر جانب دارانہ طور پر محنت کرنا، باقی رب راکھا''۔ (مروجہ تکافل کا فقہی جائزہ: ۲۸۔۲۹)

حالانکہ ایک موضوع پر تحقیق کرنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ جانے والا شخص اگرچہ مخلص ہی ہو عموماً سائل کو قائل ہی کیا کرتا ہے، اس طرح وسعتِ نظری کا راستہ نہیں دکھایا کرتا۔ صاف واضح ہے کہ یہ علمی اختلاف اور فتوے کا فرق ان کا ذاتیات کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی کوشش تھا۔ جس بات کو علمی اور اصولی بنیادوں پر درست سمجھا اسے اختیار کرلیا، اور جن دلائل پر مطمئن نہ ہوئے، اسے ترک کر دیا۔

بعض جدید مسائل میں موقف کا یہ اختلاف آخر عمر تک رہا، لیکن دیانت داری کا عالم یہ ہے کہ فریق ثانی کو لاعلمی اور جہالت کا طعنہ دیے بغیر بھرپور اِختلاف کیا اور وہ بھی اس طرح کہ دوسرے کی علمی صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

یاد پڑتا ہے کہ غالباً ۲۰۰۸ء میں مادرِ علمی جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں چند مختلف فیہ مسائل کی تحقیق کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر ایک اجلاس ہوا۔ آخری اجلاس سے فراغت کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ باہر نکلے تو مفتی عبداللہ شوکت صاحب نے جامعہ بنوریہ چلنے کی دعوت دی۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے قبول فرمالی۔ میں چونکہ خدمت کے لیے ساتھ ساتھ تھا، اس لیے گاڑی میں گنجائش کی بناء پر ساتھ ہی چلا گیا۔ چند دیگر اساتذہ کی موجودگی میں بینکنگ اور تکافل وغیرہ کے مسائل کے بارے میں مفتی

نعیم صاحب نے کچھ گفتگو فرمائی، چند لوگوں کے شخصی حالات بیان فرمائے، اور اسلامی بینکاری کی بابت حضرت ڈاکٹر صاحب کی رائے پوچھی تو جدید معاشی مسائل میں مفتی تقی عثمانی صاحب سے اختلاف کے باوجود حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا:

> ’’مفتی تقی عثمانی صاحب کا ذہن ایک ماہر فقیہ کا ذہن ہے، بہت دُور تک پہنچ جاتا ہے۔ انہوں نے اسلامی بینکاری کو بڑی محنت سے مرتب کیا ہے، اور بہت حد تک اصلاح کی ہے، اگر سو فیصد غلطی تھی تو اُسے سدھار کر بیس فیصد غلطی تک لے آئے ہیں۔ اور ہم یہ تو نہیں کہتے کہ اَب یہ سودی ہے، لیکن بعض معاملات ابھی بھی ایسے ہیں جو ناجائز ہیں۔ اُن کی اصلاح ابھی باقی ہے‘‘ [مکمل الفاظ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے نہیں ہیں لیکن مفہوم تقریباً مکمل وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا]

ملاحظہ کیجیے کہ جدید اسلامی بینکاری اور معاشی و اقتصادی نظام کے واضعین کے سب سے بڑے ناقد ہونے کے باوجود کتنی دیانت داری سے متین اور معتدل تبصرہ کیا ہے جو ہم جیسے طالب علموں کے لیے سرمۂ بصیرت ہے۔

’’تکملہ فتح الملہم‘‘ مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب کے قلم سے نکلا ہوا ایسا شاہکار ہے جس کی معاصرین میں نظیر دشوار ہی نہیں، قریب قریب عنقا ہے۔ اس کے مطالعہ کے دوران حدیث حِبر کی تشریح پڑھی تو اس پر کچھ اشکال پیدا ہوا۔ کتبِ علم کلام، کتب حدیث اور دیگر شروحِ کتب حدیث کی مراجعت کی، تو خیال ہوا کہ اپنا حاصلِ مطالعہ حضرت استاذ محترم مفتی تقی عثمانی صاحب کی خدمت میں ارسال کر دوں، یا تو میری اصلاح ہو جائے گی یا اگر تحریر میں تبدیلی مناسب معلوم ہوئی تو تبدیلی فرما دیں گے، لیکن کہاں مجھ سا ہیچ مدان، اور کہاں حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب!! خیر وہ پانچ چھ صفحات کی تحریر، جس میں، میں نے بزعم خود حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب کی عبارت کا تخطئہ کیا تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کی، ذہن میں یہ تھا کہ یہاں سے تائید و توثیق ہو گئی تو اس کے بعد مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں ارسال کر دوں گا، اور ذہن میں غالب امکان یہی تھا کہ تائید ہو جائے گی۔ اگر تائید نہ ہوئی تو بس نہیں بھیجوں گا، گو اِس کا امکان نہیں تھا۔

مگر امید کے بالکل برعکس یہ ہوا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے میری تحریر کا تخطئہ کر دیا کہ اعتراض قوی نہیں ہے، بلکہ ’’تکملہ‘‘ کی عبارت کی تائید کر دی۔ میں نے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی تحریر کو بارہا پڑھا، لیکن اُن کے تبصرہ سے ایسا اتفاق نہ ہو سکا کہ میں اِسی جہت کو راجح مان لیتا، اور اپنے موقف کو چھوڑ دیتا، لیکن چونکہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے تحریر پاس نہ ہو سکی، تو حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب کی

خدمت میں ارسال بھی نہ کی۔ بعد میں کئی دوستوں نے کہا بھی کہ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب کی خدمت میں اپنی تحریر ارسال تو کردو، لیکن بس ہمت ہی نہیں ہوسکی۔ آج بھی میری فائلوں میں وہ تحریر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے تنقیدی تبصرے سمیت ریکارڈ کے طور پر محفوظ ہے۔ جسے اپنی موجودہ صورت حال میں تو اِرسال کرنا ممکن نہیں، لیکن اتنا ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے تبصرے کی روشنی میں مزید تحقیق کا دروازہ کھل گیا ہے۔ موجودہ علمی مصروفیات سے کچھ فراغت میسر ہوئی تو نظر ثانی کے بعد ہی دیکھوں گا کہ بحث کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اور پھر قابل ارسال بھی رہتا ہے یا نہیں۔ واللہ الموفق

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے عقیدت تو خیر پیدا ہو ہی چکی تھی، جوں جوں وقت گذرتا گیا توں توں محبت بڑھتی گئی۔ اور اُن کی شفقت کا عالم بھی یہ تھا کہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ جب بندہ کی تحقیق و تعلیق سے کتاب: ’’**الزّهرُ البَاسِم فی سِیَر أبِی القَاسِم** ﷺ‘‘ مصر سے دو جلدوں میں چھپ کر آئی تو اس کا ایک نسخہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ اس پر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے دو ہزار روپے عنایت فرمائے اور فرمانے لگے: یہ قیمت نہیں ہے، اِنعام کے طور پر ہے۔ اس پر جتنی خوشی ہوئی بیان سے باہر ہے، اور میں نے اس موقعے پر عرض بھی کیا کہ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب نے جب ’’تکملہ فتح الملہم‘‘ کی ایک جلد بہ طور ہدیہ حضرت مولانا یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کی تھی تو انہوں نے بھی پانچ سو روپے حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب کو بطور انعام دیے تھے، جس کا اُنہوں نے خود بھی تذکرہ کیا ہے۔

اِس کے چند سال بعد بندہ کی تحقیق و تعلیق سے ایک دوسری کتاب ’’**مَجْمُوع اجَازَات و رَسَائل الامَام محمَّد عابِد السِّندیّ**‘‘ تین جلدوں میں اُردن سے چھپ کر آئی، تو اس کا بھی ایک نسخہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے مجھے پانچ ہزار روپے بہ طور انعام عنایت فرمائے، جو میرے لیے اندازے سے بہت زیادہ تھے۔ میں نے بہ طور حیرت کے عرض کیا: استاد جی! یہ تو پانچ ہزار ہیں!! حضرت ڈاکٹر صاحبؒ سمجھے کہ شاید میں نے یہ کم سمجھے ہیں، فرمانے لگے: اچھا! کتنے ہونے چاہیے تھے؟ میں نے عرض کیا: جی! تین جلدوں کی کتاب ہے، فی جلد ایک سو روپے کے حساب سے تین سو روپے کافی ہیں۔ ورنہ فی جلد ایک ہزار کے حساب سے تین ہزار بھی بہت ہیں۔ لیکن اگلی کتاب ’’**طَوَالِعُ الأَنْوَار شرح الدُّرِّ المُخْتَار**‘‘ **للشیخ محمد عابد السندِیّ**‘‘، تو تقریباً چالیس جلدوں کی ہے، تو اس کے تو بہت زیادہ پیسے بن جائیں گے۔ اس پر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کافی دیر تک مسکراتے رہے، اور فرمایا: جلدوں کی تعداد کا حساب نہیں، بس جتنے موقعے کے لحاظ سے میسر ہوئے وہ دے

دیے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیروں ڈھیر انعام واکرام سے نوازے، اوران کے درجات بلند فرمائے، ان اکابر کی حوصلہ افزائیوں سے ہم جیسوں کے قدم جمے رہتے ہیں۔

اِس جگہ اس بات کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جا رہا کہ چند سال پہلے حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ طواف زیارت کے موقعہ پر حرم کا مجمع اپنے جوبن پر ہوتا ہے، اس سب کے باوجود نہ کھینچا تانی کی اور نہ کوئی خاص شعوری کوشش، بلکہ مجمعے کا بہاؤ جہاں لے جاتا رہا، ادھر کو جاتا رہا جب طواف کا ساتواں چکر ختم ہوا تو بالکل ملتزم کے نزدیک کھڑا تھا۔ اب تھوڑی سی کوشش اور انتظار کے بعد ملتزم تک پہنچ گیا، اور جو دعائیں کیں سو کیں، ان میں سے ایک دعا اپنی شدید خواہش پوری ہونے کی بھی کہ: ”اے اللہ! طوالع الانوار“ کا کام آسانی سے پورا کرا دے، اور والدہ محترمہ، استاد جی حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب، ڈاکٹر عبدالواحد صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی زندگی میں چھپوا بھی دے۔ بڑی آرزو تھی کہ کتاب مکمل ہو، اوران حضرات کی خدمت میں پیش کر کے ان کی دعاؤں کی دولت سمیٹوں، مگر اللہ تعالیٰ غنی اور صمد ذات ہے، سب اس کے محتاج اور منگتے ہیں، وہ جو چاہے کرتا ہے۔ ان مذکورہ بالا حضرات میں سے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ وفات پا گئے۔ دل مسوس کر رہ گیا، مگر تسلیم و رضا کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی اکابر حضرات کی زندگی میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

کتابوں کا تذکرہ آیا ہے تو برسبیل تذکرہ، امام نسائی کی ”خصائص علیؓ“ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ میاں رضوان نفیس صاحب کی تشجیع وتحریض پر مذکورہ کتاب کا اُردو ترجمہ کیا۔ پہلا ایڈیشن نفیس اکادمی سے انہی نے شائع کیا۔ اس کا ایک نسخہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں اس فرمائش کے ساتھ پیش کیا کہ اس پر کچھ تحریر فرما دیں۔ بڑی ہی سادگی سے فرمانے لگے: تقریظ لکھنی ہے؟ میں نے عرض کیا: حضرت سید نفیس شاہ صاحب کے حلقے کے بعض افراد کی طرف سے واقعۂ کربلا اور اہل بیت کے موضوع پر کچھ ایسی تحریریں سامنے آئی ہیں، جو افراط وتفریط پر مبنی ہیں، اوران کی وجہ سے پورے حلقے میں تشویش پھیل رہی ہے۔ اگر اہل سنت و جماعت کے مسلک کی طرف بھی کچھ اشارہ ہو جائے تو بہت مفید ہوگا۔ اس پر حضرت رحمہ اللہ نے جو کچھ تحریر فرمایا، اسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، اس لیے بھی کہ حضرت نفیس شاہ صاحب اوران کے متوسلین کے معتمد علیہ حضرات کا مسلک معلوم ہو جائے جو کہ افراط وتفریط سے خالی ہے، اوراس لیے بھی کہ ابھی تک مذکورہ کتاب کی دوسری مرتبہ طباعت نہیں ہوسکی، گویا حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کی یہ تحریر تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ تحریر درج ذیل ہے:

اہل السنۃ کا مسلک اعتدال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت علی رضی اللہ عنہ گوناگوں فضائل وخوبیوں والے تھے، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱- رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، اور آپ ﷺ کے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے۔

۲- رسول اللہ ﷺ کے داماد، اور آپ ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر تھے۔

۳- جنت کے نوجوانوں کے سردار حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے والد تھے۔

۴- رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے ''اہل بیت'' میں سے شمار کیا۔

۵- بچوں میں سب سے پہلے ایمان لائے۔

۶- شہادت سے سرفراز ہوئے۔

۷- خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے چوتھے نمبر پر تھے۔

۸- سابقہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے معاون ومددگار تھے۔

۹- باغیوں کے محاصرے کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے اپنے صاحبزادوں کو مقرر کیا تھا۔

۱۰- عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔

۱۱- قضاء کے بڑے ماہر تھے: ''**أَقْضَاهُمْ عَلِيٌّ رضی الله عنه**''

۱۲- مشاجرات میں بروئے نص حق پر تھے۔

۱۳- خارجیوں سے جنگ نہروان لڑی اور ان کی کمر توڑ دی۔

۱۴- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جن کا میں دوست ہوں علی بھی اس کے دوست ہیں۔''

۱۵- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں علی رضی اللہ عنہ سے ہوں اور علی مجھ سے ہیں۔''

۱۶- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''علی کا تعلق مجھ سے ایسا ہے جیسا حضرت ہارون علیہ السلام کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔'' (البتہ اتنا فرق ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نبی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی نہیں تھے۔)

۱۷- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے وقت خلافت کے لیے جو چھ نام تجویز کیے، ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے اور کہا کہ: ''رسول اللہ ﷺ اپنی وفات تک ان سے راضی تھے۔''

۱۸- جنگ جمل اور جنگ صفین میں فریق مخالف کی شرعی حیثیت واضح کی کہ: ''یہ ہمارے

مسلمان بھائی ہیں، جنہوں نے (خطائے اجتہادی سے) ہمارے خلاف بغاوت کی۔'' یہ ایک بڑی علمی دریافت تھی، کیونکہ خارجیوں کو اس میں اشکال تھا۔

ایسے فضائل والی ذات کے بارے میں امام نسائی رحمہ اللہ جیسے عظیم محدث کی کتاب نہایت عالی شان اور قیمتی ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا ہر فرد جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تمام صحابہ پر فضیلت کا قائل ہے، اسی طرح اس کا دل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت سے خالی نہیں ہوسکتا۔

امام نسائی رحمہ اللہ کی کتاب ''**خَصَائِصُ عَلِيٍّ رضی الله عنه**'' کا ترجمہ مولانا احسن احمد سلمہ نے کیا اور اس کو چھپوانے کا انتظام جناب رضوان نفیس صاحب سلمہ نے کیا۔ یہ دونوں حضرات بہت ہی مبارکبادی کے حقدار ہیں۔

مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب رحمہ اللہ کا مقالہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ومقام'' بھی شامل اشاعت ہے۔ پھر امام نسائی رحمہ اللہ کے حالات پر ایک ضخیم مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ تمام مضامین مل کر ایک بہت ہی جامع اور مفید کتاب بن گئی ہے۔

جن دیگر حضرات نے کتاب کی نشر واشاعت میں حصہ لیا، اللہ تعالیٰ ان کو بہت بہت اجر سے نوازیں، اور سب کے اجر کے مجموعے سے بھی کئی گنا زیادہ اجر حضرت سید نفیس الحسینی شاہ رحمہ اللہ کو عطا فرمائیں، جنہوں نے اپنی عمر کا آخری بڑا حصہ اہل بیت کی محبت پھیلانے میں خرچ کیا۔ آخر میں یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم جیسے بے مایہ کو پار لگا دیں، جو اہل بیت اور اہل سنت کی محبت کا، اللہ تعالیٰ کی محض عطا سے کچھ قلیل سرمایہ رکھتے ہیں۔ **وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.**

(ڈاکٹر مفتی) عبدالواحد (۴ ر رجب ۱۴۳۵ھ)

مجھے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا باقاعدہ شاگرد تو شمار نہیں کیا جاسکتا، بس جزوی استفادے کی سی کیفیت رہی، البتہ اپنے علمی وتحقیقی سفر میں رہنمائی کا سلسلہ ان سے ضرور جوڑے رکھا۔ البتہ چھوٹے بھائی مفتی طلحہ جواد صاحب نے دارالعلوم کراچی سے دورۂ حدیث کرنے کے بعد حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس تخصص فی الفقہ الاسلامی میں باقاعدہ داخلہ لیا، اور تین سال تخصص کا دورانیہ مکمل کیا، اور اس کے بعد مدرسہ سیدنا علی میں ہی کئی سال تدریس بھی کی، اس وجہ سے مختلف موضوعات کی فقہی ابحاث ہمارے مابین چلتی رہتی تھیں، جن سے مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ مسائل کی تحلیل اور پھر ان کا شرعی حل معلوم کرنے میں ذہن اور طبیعت کے رواں ہونے کے لیے باقاعدہ ماحول میں رہنے اور سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی سلسلے میں مفتی طلحہ جواد صاحب کو ساتھ لے کر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے وقت لے کر گھر میں

حاضر ہوا، اور اپنا مدعا عرض کیا کہ مذکورہ بالا مقصد کے پیشِ نظر تخصص فی الفقہ میں داخلہ لینا چاہیے یا نہیں، یا کیا کروں؟ اور اس لیے بھی حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے یہ مشورہ کیا تھا کہ وہ میری ''طوالع الانوار'' کی مصروفیت اور مسلسل مشغولی کو بھی خوب اچھی طرح جانتے تھے، اور ٹوٹی پھوٹی استعداد سے بھی واقف تھے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے پوری بات سن کر اپنی عادت کے موافق کچھ دیر سوچتے ہوئے خاموشی اختیار فرمائی، پھر فرمانے لگے: مولوی صاحب! ہر آدمی کا اپنا اپنا میدان ہوتا ہے، اور ہر میدان میں کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ آپ ''طوالع الانوار'' کا کام مکمل کرلیں، اس کے بعد ہم ہی آپ کو تخصص کی سند دے دیں گے۔ گویا میرے لیے تصنیف وتالیف اور خصوصاً ''طوالع الانوار'' کے کام کو جاری رکھنا طے فرما دیا۔ اور تادمِ تحریر میں اسی کام میں مشغول ہوں، اور ان دنوں جب میں اس کام کو روک کر یہ مضمون لکھ رہا ہوں، بائیس جلدیں مکمل ہو چکی ہیں، اور تیئیسویں جلد پر کام چل رہا ہے۔ **و الحمد لله علی ذلک، و بالله التوفیق**

اس کے بعد میں یکسوئی سے کتاب کے کام میں مشغول ہو گیا۔ اور مستفتی حضرات کے سوالات کچھ عرصہ تک تو عام پیش آمدہ مسائل کے دائرہ میں ہی رہے، لیکن پھر کچھ علماء حضرات نے بھی رجوع کیا تو کئی ایسے مسائل پیش آئے جن کے کسی قدر تفصیلی جوابات لکھنے پڑے۔ چونکہ اپنے آپ پر اعتماد نہ کل کیا نہ آج کرتا ہوں، اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اساتذہ میں سے کسی کو دکھالیا جائے، حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب، حضرت الاستاذ مفتی عبدالقدوس صاحب ترمذی اور مفتی عطاء الرحمٰن صاحب (مدیر و شیخ الحدیث: دارالعلوم مدنیہ بہاول پور) سبھی اساتذہ سے بہت اچھا تعلق رہا ہے، بلکہ اَب بھی ہے، لیکن طبیعت کی مناسبت، اور نظر کی گہرائی و گیرائی کی وجہ سے نظر حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ پر ٹھہر گئی، کہ آپ ہی سے مشورہ کروں کہ ایسے مسائل میں کچھ لکھا کروں یا نہیں یا جو لکھوں تو وہ آپ کو دکھا لیا کروں؟ اس میں اس طرف سے بھی اطمینان تھا کہ سابقہ تعلق اور کچا چٹھا سامنے ہونے کی وجہ سے مناسب ہوا تو ڈانٹ بھی دیں گے، کہ تمہیں کس نے فتویٰ لکھنے کی اجازت دی، مت لکھا کرو۔ اور اگر مناسب سمجھا تو کوئی رہنمائی فرما دیں گے کہ یوں لکھا کرو۔ خیر ہر چہ بادا باد، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ ہی سے رابطہ رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

آخری چند مرتبہ کی کسی ایک حاضری میں جو چند تفصیلی تحریریں لکھی تھیں، ان کا خلاصہ اور نتیجہ نوٹ کر کے ساتھ لے گیا اور ان مسائل کی تحقیق کو بھی خدمت میں عرض کیا، اور اپنی اس مشکل کا بھی ذکر کر دیا کہ جی چاہتا ہے کہ ایسی تفصیلی تحریر اپنے اساتذہ میں سے کسی کو دکھالیا کروں، اور ممکن ہو تو آپ کی نظر سے گذر جائے، مگر آپ کی مصروفیات کی وجہ سے تذبذب میں مبتلا ہوں، تو فرمانے لگے: ''ٹھیک ہے کوئی ایسا مسئلہ ہو تو لکھ کر دکھا لیا کیجیے۔ لیکن اس طرح کریں کہ پہلے مفتی رفیق صاحب کو دکھالیا کریں۔ اگر ضرورت ہوئی تو وہ مجھے دکھا

دیں گے‘‘۔ اُن کے اِس جواب سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ چلو میری تحریر کسی نہ کسی درجے میں حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی نظر کے سامنے آجایا کرے گی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ سیدھا بوجھ حضرت ڈاکٹر صاحب پر نہ رہے گا۔ اور جناب مفتی رفیق صاحب سے کسی درجے میں بے تکلفی ہے، تو اُن سے رابطہ کرنے میں اتنی ہچکچاہٹ نہ ہوگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مفتی رفیق صاحب پر حضرت ڈاکٹر صاحب کے اعتماد کا اندازہ بھی ہوا، کہ استاد جی فتوے جیسے حساس اور نازک کام میں کسی پر اعتماد کا اظہار یونہی رواداری میں تو نہیں کر سکتے تھے، ضرور ان پر تسلی کی بنیاد پر یہ فرمایا تھا۔

بہاولپور میں بڑی بڑی تعلیمی جامعات میں سب سے پہلے جامعہ دارالعلوم مدنیہ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ وہاں کے مہتمم شیخ الحدیث اور صدر المدرسین مفتی عطاء اللہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ علاقے کے مشہور مفتی اور اہل اللہ میں سے ہیں۔ اسی ادارے کے مفتی جناب مفتی یوسف صاحب سے بھی میری اچھی یاد اللہ ہے۔ مختلف فقہی مسائل میں ان حضرات سے افادہ واستفادہ کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ علاقائی سطح پر چند ایسے حضرات جو تبلیغی اور دیندار تو تھے، مگر ان کا کوئی علمی و تحقیقی پس منظر نہیں تھا، ان کی طرف سے شرعی مسائل بتانے اور باقاعدہ فتوے دینے کا سلسلہ شروع ہوا، اور سلسلہ بھی دراز ہی ہوگیا، تو اس پر غور وفکر اور اس کے سدباب کے لیے مفتی یوسف صاحب سے مشاورت ہوتی رہی، انہی مجالس کے نتیجے میں ’’**مَجْمَعُ الفِقْهِي الإسلامي، بَهَاوَلْفُور**‘‘ کی تاسیس عمل میں آئی۔ مختلف مدارس اور جامعات کے اساتذہ سے ملاقاتیں، ان کی علمی وفقہی صلاحیتوں سے استفادہ کا لائحہ عمل اور پھر اس مجلس کے باقاعدہ اجلاسوں کی ترتیب بنی جس کی کچھ تفصیل شاید (دارالعلوم مدنیہ کے ترجمان) مجلّہ ’’المصطفیٰ‘‘ میں چھپ بھی چکی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مختلف مسائل میں، خصوصاً جدید مسائل میں جو حضرات الل ٹپ قسم کے فتوے دے رہے ہیں، اور سیدھے سادے عوام کو بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ علماء کرام میں تو مسائل کا اختلاف ہی بہت ہے، ہم کدھر جائیں، اس تاثر کا سدباب ہو جائے۔ اور کم از کم بہاولپور کی سطح پر علماء کا ایک ایسا پلیٹ فارم ضرور ہو جس میں اتفاقی طور پر (یا پھر اختلافی نوٹ کے ساتھ) طے شدہ مسائل کو کوئی حتمی شکل دے کر حاصل بحث کو عوام کے لیے مرتب کر دیا جائے۔

کام تو بہت بڑا، اور بہت ہی اہم نوعیت کا ہے، اور جس سے بھی ذکر کیا، اس نے تائید وتوثیق بھی کی اور دعائیں بھی دیں، مگر اس کی حساسیت کے پیش نظر اس کا تقاضا یہ بھی تھا کہ اسے بہت دقیق النظر مفتیان کرام کی سرپرستی اور تائید کے ساتھ چلایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جن حضرات نے سرپرستی قبول فرمائی، ان میں ایک تو مفتی عطاء الرحمٰن صاحب ہی ہیں۔ آپ نے عملی طور پر شریک ہونے سے تو معذرت کر لی کہ

دوسری ذمہ داریاں بہت ہیں، مگر ہمارے کیے ہوئے کام پر نظرِ ثانی، اس کی تصحیح اور اس پر تنقید وغیرہ کے سلسلے میں سرپرستی قبول فرمائی۔

اس کے بعد اس کام کا خاکہ اور اس کی کچھ کارگزاری حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی عرض کی، اور سرپرستی کی درخواست کی، جو آپ نے قبول فرمائی، مگر اس مرتبہ بھی پہلے مفتی رفیق صاحب کی طرف رجوع اور پھر دیکھنے کی ترتیب بتائی، اور ہماری اس کوشش پر ہماری ہمت بندھائی، جو ہمارے لیے اطمینان کا باعث تھا۔ ورنہ اگر ہمیں اس طرز سے کام کرنے سے روک دیتے، تو یقیناً ہمارے لیے اس سے رکنا ہی طے تھا، کہ اپنے اکابر حضرات کی خدمت میں حاضری اپنی اصلاح کے لیے ہی ہوا کرتی ہے۔ **فَجَزَاهُ اللّٰهُ خيراً أحسَن الجَزاء**۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے، ان شاء اللہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اس سلسلے کے فوائد وبرکات کے عام ہونے کی وجہ سے اللہ کے ہاں عظیم اجر کے مستحق ہوں گے۔

جب مفتی عبدالرحمٰن نذر صاحب نے تخصص فی الفقہ الاسلامی کی تکمیل کی تو تخصص کے تیسرے سال میں عقائد کے موضوع پر مقالہ لکھنا ان کے ذمے لگا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے خود بھی ایک کتاب بنام ''صفات متشابہات اور سلفی عقائد'' مرتب کی، جو چھپ کر اہل علم کے ہاں بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں سلفی عقائد کے بعض ایسے گوشے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے تھے، جنہیں عام طور پر سلفی حضرات وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے اپنی عادت کے موافق بڑی گہرائی کے ساتھ موضوع کا مطالعہ کیا، اور پھر اپنی معروف گرفت کے ساتھ سلفیہ کے موقف کی کمزوری اور غلطی کا ذکر کیا جب کتاب چھپی تو میں نے دارالافتاء میں اپنے قابل قدر مفتیان کرام کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کتاب کا عربی میں ترجمہ بھی آنا چاہیے۔ تو آپ حضرات میں سے کوئی ایک ساتھی اس کام کو سرانجام دیں، خصوصاً مفتی شعیب صاحب سے عرض کی، کہ ان کا قلم بہت سیال ہے۔ مگر بات مشورے تک ہی رہی اور کچھ طے نہیں ہو پایا۔ کچھ ہی عرصہ گذرا ہوگا کہ ایک دن مفتی عبداللہ صاحب دامت برکاتہم کا فون آیا، فرمانے لگے کہ والد صاحب سے بات کریں۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے ''صفات متشابہات اور سلفی عقائد'' کا عربی ترجمہ کرنے کا تذکرہ فرمایا۔ میں چونکہ ''طوالع الانوار'' کا کام ذمے لیے بیٹھا تھا، اور تب تو بہت ہی ابتداء میں تھا، بظاہر وقت نکالنا ممکن نہ تھا، مگر استاد جی کا مجھ ناکارہ سے فون پر رابطہ کر کے کہنے کا وزن یقیناً بہت زیادہ تھا۔ میں نے عرض کیا: استاد جی! اس ضرورت کا اظہار تو میں نے بہت پہلے مفتی عبدالرحمٰن صاحب اور مفتی شعیب احمد صاحب سے کر دیا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ

حضرات آپ کے پاس رہتے ہوئے زیادہ بہتر طریقے سے اس کام کو کرسکتے ہیں۔ لیکن اب آپ نے فرمادیا ہے تو بس دعا فرمادیں، میں ان شاء اللہ اسے ضرور پورا کروں گا۔ استاد جی نے اس کے معاوضے کا بھی ذکر فرمایا، مگر سعادت حاصل کرنے پر کیسا معاوضہ!! گو کتاب کا ترجمہ مکمل ہونے سے قبل ہی حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے بہت ہی معقول رقم مفتی عبداللہ صاحب کے ذریعے بھجوادی تھی۔ **فجزاہ اللہ خیراً**

خیر کچھ ہی عرصہ گذرا، تھوڑا تھوڑا کام کرتے کرتے تعریب کا کام مکمل ہوگیا۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے خود نظر ثانی فرمائی۔ واصل واسطی صاحب نے کچھ جواب دیا، اس کی وجہ سے کچھ تبدیلیاں کرنے کی نوبت آئی۔ پھر اسے عربی کتب کے معاصر انداز میں ڈھالا تو کچھ کتابوں کے حوالے قابلِ مراجعت تھے، وہ سب بھی ہوگیا، اجمالی فہرست بھی تقریباً تیار ہوچکی تھی۔ مصر میں ایک مکتبے والوں سے طباعت کی بات چل رہی تھی۔ ایک دن مفتی عبداللہ صاحب کا فون آیا کہ والد صاحب فرمارہے ہیں کہ مولوی صاحب سے کہیں کہ آپ تو ہماری کتاب کو بھول ہی گئے۔ اور سچ یہ ہے کہ میں اس کو بالکل بھی نہیں بھولا تھا۔ بلکہ اس کے بعض مندرجات کے بارے میں ایک دن قبل ہی مفتی عبدالرحمٰن صاحب سے بڑی طویل بات ہوتی رہی تھی۔ میں نے وہ ساری کارگذاری سنادی کہ مجھے نہ صرف یہ کہ یہ کام یاد ہے بلکہ میری ترجیحات میں سے ہے۔

مگر اس فون سے طبیعت پر بہت بوجھ رہا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ ملنے کے بعد ان کے ساتھ ایسا قرب ہوتا گیا کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب شدید محبت کی سی صورت پیدا ہوگئی، دل اس خطرے اور واہمے کو بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا کہ استاد جی کو مجھ سے یا میری کسی کوتاہی سے کوئی رنج یا تکلیف پہنچے۔ خیر! یہ کتاب حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی زندگی میں نہیں چھپ سکی، اور انتہائی عجلت کی کوشش اور شدید ضرورت کے باوجود ابھی بھی مکتبے والوں کے پاس طباعت کے انتظار میں رکھی ہوئی ہے۔ امید ہے کہ کچھ ہی عرصے میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوجائے گی۔ لیکن دل مسوس کررہ جاتا ہے جب یاد آتا ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو اس کی طباعت کا کس شدت سے انتظار تھا، اور یہ ان کی زندگی میں چھپ نہیں سکی۔

بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو کسی ادارے سے وابستہ ہوکر چمکتی ہیں اور بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی وجہ سے ادارے چمک جاتے ہیں۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی شخصیت اگرچہ ایسی بلند وبالا مقام کی حامل تھی کہ ادارے آپ کے ساتھ انتساب کو فخر محسوس کریں، لیکن آپ نے گویا اپنی شخصیت کو بالکل ہی مٹادیا تھا، اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔ میرا جامع مسجد الہلال آنا جانا بہت عرصے سے ہے، حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے نیازمندانہ تعلق تھا، اور باقی اساتذہ کرام اور علماء ومفتیان کرام سے دوستی بھی تھی،

اور استفادے کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ مفتی رفیق، مفتی عبدالرحمٰن، مفتی شعیب، مفتی سلیم صاحبان اور دیگر کی مجلس میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ جاری کرنے پر بارہا غور وفکر ہوتا رہا۔ اسی سلسلے میں حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے بھی مشاورت رہی، اور حضرت نے بھرپور رہنمائی کی۔ مفتی شعیب صاحب نے ہوم ورک کے طور ایک تحریر تیار کی، جس میں مختلف جگہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے تبدیلی بھی کی، اور کئی ایک تصحیحات بھی فرمائیں۔ چونکہ یہ شعبہ بہت اہم ہے، اور خصوصاً پنجاب میں اس نوعیت کے شعبے کے اجراء کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تصحیح وتبدیلی کے بعد مفتی شعیب صاحب کی حتمی تحریر کو بہ طور ضمیمہ مضمون کے آخر میں نقل کر دوں۔ اس سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی نظر کتنی وسیع تھی، اور مستقبل میں کتنا دور تک دیکھا کرتے تھے، وہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بالکل عام سا سمجھتے تھے۔ دیکھنے کی چیز ہے کہ میرا تعلق حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ سے تو بہت قریبی رہا لیکن بہ حیثیت ادارے کے، جامعہ دار التقویٰ سے کسی قسم کا باضابطہ تعلق یاد نہیں پڑتا۔ اس کے باوجود حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے اس تحریر میں اپنے قلم سے جو جملے ثبت فرمائے، ان میں یہ جملہ لائق توجہ ہے، فرماتے ہیں:

”......ہمیں ایک بڑی سہولت یہ بھی حاصل ہے کہ مولوی مفتی عبدالرحمٰن نذر نے مولانا عبدالحلیم چشتی مدظلہ سے تخصص فی الحدیث کیا ہے، اور اسی طرح مولانا احسن صاحب کا بھی جامعہ سے بڑا تعلق ہے، اور جن کے تصنیفی کارنامے بھی بہت ہیں، وہ بھی تخصص مولانا مدظلہ سے کر چکے ہیں......“

تو حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی اس تحریر سے جتنا میرا دل شادمان ہوا، اسے کیا بیان کروں! ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

کہ اس قسم کے علمی کام کی خدمت کا موقع تو خدا جانے، آئے یا نہ آئے، مگر اس کی اہلیت پر نظر کرتے ہوئے مفتی عبدالرحمٰن صاحب مدظلہ جیسی محنتی، قابل اور ذمہ دار شخصیت کے ساتھ ساتھ حضرت رحمہ اللہ کی نظر مجھ جیسے ناکارہ پر بھی پڑی۔ بے ساختہ زبان پر جاری ہے: ع

ایں کہ می بینم بیداری است یارب یا بہ خواب

لیکن اس کے ساتھ ساتھ دیکھنے کی اصل چیز تو یہ ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے میرے اس تعلق کو جو یقیناً حضرت رحمہ اللہ کی ذات کے ساتھ تھا، اپنے ساتھ تعلق نہیں فرمایا، بلکہ جامعہ سے تعلق فرمایا، یعنی آپ کی علمی وعملی صلاحیتوں کا محور اپنی ذات نہیں، ادارہ تھا۔ یقیناً بے نفسی اور اپنے آپ کو مٹا دینا اس کو کہتے ہیں۔

حضرت استاد جی سے میری آخری ملاقات ۱۴۳۹ھ کے رمضان میں ہوئی۔ مفتی عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ استاد جی کے گھر حاضری ہوئی۔ کافی کمزور ہو چکے تھے، گو کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی، لیکن بایں ہمہ بیٹھ کر ہی سہی، مکمل بیس تراویح مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کیں۔ اس کے بعد گھر گئے، کھانا کھلایا، اور مختلف علمی موضوعات پر گفتگو اور ہلکی پھلکی مزاح بھری باتیں فرماتے رہے۔ جب اندر سے چائے وغیرہ آنے لگی تو میں نے اس خیال سے کہ استاد جی کو اٹھنا نہ پڑے، مفتی عبدالرحمٰن صاحب سے کہا کہ آپ چائے پکڑو، میں ریڑھی (میری مراد Tea trolly یا Tea cart تھی) کو کھینچ کر قریب کرتا ہوں۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ میری بات سن کر مسکراتے ہوئے فرمانے لگے: ''دیکھو بنانے والے نے کتنی محنت سے اتنی خوبصورت چیز بنائی ہے، مولوی صاحب نے اسے ریڑھی بنا دیا۔''

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ انتہائی سنجیدہ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ جب کبھی ہنستے یا مسکراتے تو ہم جیسوں کی تو روح تک سرشار ہو جاتی تھی۔

بس یہ میری حضرت سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد اگلا رمضان آیا، جس کے بعد شوال میں انتقال ہوا، تو بہت چاہت کے باوجود بھی لاہور کا سفر نہ کر سکا، اور زیارت بھی نہ ہو سکی۔ وجہ یہ بنی کہ بچوں نے حفظ قرآن مجید شروع کر رکھا تھا، اور عید سے صرف ایک ڈیڑھ دن قبل ان کو مدرسے سے چھٹی ہوئی۔ اور عید کے چوتھے دن پھر باقاعدہ حاضری تھی۔ بس ترتیب ہی نہ بن سکی۔ اندازہ بھی نہ تھا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اتنا اچانک چھوڑ جائیں گے۔ اور پھر میں نے تو اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگ رکھی تھی کہ میری کتاب حضرتؒ کی زندگی میں ہی شائع بھی ہو جائے۔ ایک انجانا سا یقین دل میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہ دعا دنیا ہی میں پوری ہوگی۔ کیا خبر تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آخرت کے لیے ذخیرہ بنایا ہوا ہے۔ بہر حال تقدیر غالب آ گئی۔

آپ کی وفات کا صدمہ امت مسلمہ کا صدمہ ہے، جس پر عوام، علماء اور اہل دل اور اربابِ بصیرت بھی غم واندوہ سے دوچار ہیں۔ اور اس موقع پر زبان پر یہی جاری ہے کہ **"العَینُ تَدمَعُ وَ القَلْبُ یَحزُنُ، وَ اِنَّا بِفِرَاقِکَ یَا اُستَاذَنَا لَمَحزُوْنُوْنَ، وَ لا نَقُولُ اِلَّا بِمَا یَرْضَی رَبُّنَا. اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ''**

آخر میں یہ دعا ہے کہ: **''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَ ارْحَمْہُ، وَعَافِہٖ وَ اعْفُ عَنْہُ، وَ أَکْرِمْ نُزُلَہ، وَ أَنْزِلْہُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَکَ، وَ أَسْکِنْہُ الفِرْدَوْسَ الأَعْلَی، اِنَّکَ أَنْتَ العَزِیْزُ الکَرِیْمُ، وَ تُبْ عَلَینَا اِنَّکَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. آمِیْن.''**

☆......☆......☆......☆

جناب ظفر اقبال [ریسرچ اسکالر، شعبۂ فلسفہ، کراچی یونیورسٹی]

شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ اور ناصبیت

مرتب ”آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین“ کے دل آزار اِتہامات اور توہین کی حقیقت

حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ اہل سنت و جماعت کے اُن عظیم محسنین میں سے ایک تھے جن کی بدولت اہل سنت کی نصرت و دفاع کا توازن اور مسلک کا بھرم قائم تھا۔ حضرت قاضی صاحب کی بے لوث دینی، علمی اور مسلکی خدمات کے باعث آپ حلقہ اہل سنت میں بجا طور پر ”قائدِ اہل سنت“ مانے جاتے تھے۔ اگرچہ بعض سطح بینوں کو قائد اہل سنت کی دینی حمیت اور مسلکی تصلب ”تشدّد“ نظر آتا رہا، لیکن وہ تازندگی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر نصرتِ اہل سنت کا فریضہ پورے اِنہماک اور لگن کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ حضرت قاضی صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے متوسلین اور معتقدین نے آپ کے آثار و نقوش کی حفاظت اور اس سے ابلاغ و استفادے کی توسیع کے لیے کئی اہم کام سرانجام دیئے۔ ان متوسلین میں کتاب ”آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین“ کے مرتب و محشی بھی شامل ہیں۔ اُنھوں نے قائد اہل سنت کے آثار و شذرات کی اشاعت اور تدوینِ نو کے سلسلے میں کئی کام کیے ہیں۔ مرتب موصوف کے تصنیفی کاموں میں کار آمد لوازمے کے باوصف اسلوبِ تحریر کی غرابت اور، بعض اوقات، سنسنی خیزی بھی پائی جاتی ہے۔ اسلوبِ تحریر سے قطع نظر سنسنی خیزی کا یہ عمل مرتب موصوف کی نظر میں خواہ ”نظریاتی لحاظ سے ماضی کا ایک ریکارڈ محفوظ کرنے کے لیے“(۱) کتنا ہی اہم ہو، لیکن مسلکِ اہل سنت سے وابستہ دیگر افراد کے لیے بعض اوقات گم راہ کن غلط فہمیوں، بلکہ شدید دل آزاری کا سبب بھی بن جاتا ہے ـــــــ امام ابوبکر ابن شیبہؒ اور خطیب بغدادیؒ نے سیّدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مثالب کو بھی اپنی ضخیم و عظیم تالیفات میں محفوظ کر کے ”ماضی کا تاریخی ریکارڈ“ فراہم کیا تھا، لیکن شیخ زاہد الکوثریؒ سے لے کر امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدرؒ اور مناظر اسلام حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑویؒ تک کون سا ایسا بزرگ ہے جو ”ماضی کے ایک یادگار“ کے طور پر اس ”تاریخی ریکارڈ“ کی تحسین کرتا ہو؟

حال ہی میں حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے ”چند مکتوبات“ پر مشتمل ایک مجموعہ ”آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ“ [لاہور: دار الامین، ۲۰۲۳ء] برادرِ عزیز مولانا حمزہ احسانی [مدیر: مجلّہ صفدر،

لاہور] کی عنایت سے راقم السطور کو موصول ہوا۔ مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے نام اور کام سے منتسب اِس مجموعے میں اِس پُرفتن عہد میں کُل دیوبندیت کے مرجع کُل، شاگرد و جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، خلیفہ مجاز حضرت مولانا فقیر محمد پشاوریؒ، تھانوی اور مدنی نسبتوں کے مجمع البحرین، سماحۃ الامام، رئیس المحدثین، شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خان قدس سرہٗ کی صریح توہین پر مشتمل کسی گم نام شخص محمد رمضان میمن کا ایک خط نقل کیا گیا ہے۔(۲)

اس خط میں حضرت شیخ الکل قدس سرہٗ کو ناصبی قائدین کی فہرست میں شامل کر کے جس طرح توہین کی گئی ہے، اس نے اس ناکارہ ایسے لاکھوں وابستگان دامنِ سلیمؒ کے لیے شدید دل آزاری کا سامان پیدا کیا اور یہی مکتوب اِن سطور کے لکھنے کا باعث ہوا۔ مکتوب کی قباحت سے اس کی اشاعت زیادہ شنیع، قابل مذمت اور لائق نفرین ہے۔

زیرِ بحث مکتوب میں بہ زعم خود حضرت شیخ الکل رحمہ اللہ کو ناصبی قرار دیتے ہوئے بہ طورِ دلیل تین نکتے پیش کیے گئے ہیں:

”۱- پیروں سے معمولی سے معذور

۲- شکل وہی بے نور

۳- خلافتِ راشدہ کانفرنس کے نام سے اپنے مدرسے میں دھوم دھام سے ”ذکر یزید“ کرواچکے ہیں۔“(۳)

پہلے دو نکات کو پڑھ کر محسوس یہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار کوئی فاتر العقل شخص تھا۔ کسی شخص کی ناصبیت پر اس کے پاؤں کی معمولی معذوری سے دلیل لانا کسی صحیح الدماغ آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔ حضرت شیخ الکلؒ کے پیروں میں قطعاً ایسی معذوری نہیں تھی جسے اس خط میں بہ طور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ بچپن میں ایک حادثے کے باعث پاؤں میں درانتی سے چوٹ لگ جانے کی وجہ سے اس کا بہت معمولی سا اثر غور کرنے سے محسوس ہوتا تھا، لیکن اسے قطعاً معذوری سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک صحت رہی شیخ بنا کسی سہارے کے چلتے پھرتے رہے۔

دوسرے نکتے میں، معاذ اللہ، اس محدث وقت کے چہرے کی توہین کا ارتکاب کیا گیا ہے، جن کے حسین چہرے اور شکیل سراپے کی زیارت سے بہرہ مند ہزاروں افراد اَب تک موجود اور گواہ ہیں کہ حضرت اقدس قدس سرہٗ کا روئے مبارک ۷۲ سال مسلسل خدمت و درس حدیث کے اَنوار سے کیسا منور تھا۔ حضرت شیخ الکلؒ کے بلاواسطہ شاگرد اور حاضر باش اصحاب میں سے ایک مولانا مفتی محمد تقی عثمانی بھی ہیں۔ وہ حضرت

شیخ کے انتقال پر لکھے گئے مضمون میں اپنے تلمذ کی ابتدا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سب سے پہلے اس تعلیمی سال کے آغاز میں ملاقات ہوئی۔ حضرت اُس وقت نوجوان تھے۔ حسین اور شگفتہ چہرا، دل کش اندازِ گفتگو اور سادہ اور بے تکلف اندازِ زندگی۔''(۴)

تیسرے نکتے میں، جس کا تعلق ناصبیت سے ہے، مرتب کتاب نے بغیر کسی حوالے اور دلیل کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت شیخ الکلؒ ناصبیت سے متاثر تھے۔ لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کراچی میں جب فتنہ ناصبیت نے سر اٹھایا تو متاثرین میں حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ بھی تھے۔''(۵)

شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ زندگی کے کسی دور میں ناصبیت سے متاثر نہیں رہے، لیکن اُن کے متعلق کچھ مجہول اَفراد کی طرف سے بعض معاصر علما تک اِس نوعیت کی خبریں ماضی میں گردش کرتی رہی ہیں۔ مولانا مفتی سیّد عبدالشکور ترمذیؒ سے بھی ایک ''مجہول'' حضرت شیخ الکلؒ کے متعلق اِس نوعیت کی خبر پہنچا کر اُلجھا تھا۔ حضرت مولانا ترمذیؒ چوں کہ حضرت شیخ الکلؒ کے دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی کے ہم سبق اور بے تکلف دوست ہونے کے باعث حضرت شیخ کے مسلک و مشرب، ذوق و مزاج اور حمیت اور غیرت سے پوری طرح آگاہ تھے، اِس لیے اُنھوں نے اُس شخص کو سمجھایا اور اِس ناروا حرکت سے باز رہنے کی ہدایت کی، لیکن وہ شخص نہیں مانا، حالاں کہ حضرت مولانا ترمذیؒ ایسے حساس اور متصلب عالم کا سمجھا دینا ہی اُس مجہول معترض کی تسلی کے لیے کافی ہو جانا چاہیے تھا۔ حضرت شیخ الکلؒ کے نام ایک مکتوب میں حضرت مولانا ترمذیؒ نے اِس کا تذکرہ بھی فرمایا، اس کے جواب میں ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کو حضرت شیخ الکلؒ نے جو مکتوبِ سامی تحریر فرمایا، اس کے مطالعے سے صورتِ واقعہ کی حقیقت، حضرت شیخ کا ذوق و مزاج اور دونوں بزرگوں کے مابین مضبوط تعلق اور بے تکلفی بھی ثابت ہوتی ہے۔ مولانا سیّد عبدالقدوس ترمذی لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب حضرت والد صاحب سے حضرت شیخ کے متعلق اُلجھتے رہے کہ وہ محمود احمد عباسی کے نظریات سے متاثر ہیں۔ ہر چند حضرت والد صاحب نے اُنھیں سمجھایا، مگر وہ اپنے موقف پر بہ ضد رہے اور بات اُنھوں نے دُور تک پہنچا دی۔ حضرت والد صاحب نے یہ سارا واقعہ حضرت شیخ کو تحریر فرمایا۔ حضرت شیخ نے اپنے قدیم تعلق کی بنا پر شکوے کے انداز میں اس کا یوں جواب اَرقام فرمایا:

''بندۂ خدا آپ کو کسی ثالث کے اطمینان کے لیے مجھ سے تحقیق کی ضرورت پیش آ رہی ہے، خود ہی آپ نے کیوں اُس بدگمان کا دماغ سیدھا نہیں کر دیا اور اگر وہ کوئی قابل احترام شخصیت تھی تو اُس سے کہا ہوتا کہ اس کی کوئی تحریر، کوئی تقریر، کوئی عام نشست کی گفتگو آپ کے ملاحظہ میں آئی ہے؟ اگر آئی ہے تو اسی

پر فیصلہ کرلو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر یہ کچھ نہیں تو خواہ مخواہ عبث میں مبتلا ہو کر کیوں عاقبت برباد کرتے ہو۔

میرے خیال میں انفرادیت اختیار کرنا بڑی مہلک بیماری ہے، اور بہت سے لوگ اِس چکر میں تباہ ہوئے ہیں، اس لیے میں تو اس سے ہر وقت گریزاں رہتا ہوں۔ ویسے بھی یہ بیماری ذہین مفرط قسم کے لوگوں کو ہوتی ہے اور میرا ذہن تو بقدر گزارہ ہے، مجھ جیسوں کو یہ بیماری یوں بھی نہیں لگا کرتی۔ البتہ عباسی فتنہ سے متأثر بے شک میرے پاس آجاتے ہیں، (٦) لیکن بحمد اللہ یہاں آکر ان کی اصلاح ہوتی ہے، وہ مجھے خراب کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ایک گونہ مشن کے اتحاد کے باعث ایسے اتفاقات کبھی کبھی ہوتے ہیں کہ ان سے ملاقات ہوتی ہے، لیکن کتنے ایسے میری نظر میں ہیں جن کے اندر احقر کی کوششوں سے اعتدال اور میانہ روی پیدا ہوئی ہے۔'' (٧)

معترض کے پاس حضرت شیخ الکلؒ کے ناصبیت کی طرف میلان کے کوئی دستاویزی شواہد یا ثبوت موجود نہیں تھے، ورنہ وہ اسے مولانا ترمذیؒ کے روبہ رو ضرور پیش کرتا۔ معترض نے مولانا ترمذیؒ کے مقتدر عالم ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اِس اَمر میں اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی، لیکن جب مولانا ترمذیؒ نے حضرت شیخ الکلؒ کی طرف سے اس کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی تو وہ نہ صرف یہ کہ نہیں مانا، بلکہ بہ قول مولانا سیّد عبدالقدوس ترمذی: ''مگر وہ اپنے مؤقف پر بہ ضد رہے۔'' گویا اس کارروائی سے حضرت شیخ الکلؒ کے متعلق صورتِ حال کی تحقیق نہیں، بلکہ بہ ہر صورت شیخ کو ناصبیت سے متہم کر کے اُن کی متفق علیہ شخصیت کو اعتقادی لحاظ سے مجروح کرنا مقصود تھا۔ مولانا عبدالقدوس ترمذی کا تحریر فرمودہ اگلا جملہ: ''اور بات انھوں نے دُور تک پہنچا دی۔'' اس امر کا غماز ہے کہ یہ اتہام منظّم منصوبہ سازی کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔ مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے نام محمد رمضان میمن کا خط بھی اسی مشاغبے کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ مولانا ترمذیؒ کا حضرت شیخ الکلؒ کو اس سازش سے باخبر کرنا اور اس کے جواب میں حضرت شیخ الکل کا یہ فرمانا: ''خود ہی آپ نے کیوں اس بدگمان کا دماغ سیدھا نہیں کر دیا اور اگر وہ کوئی قابل احترام شخصیت تھی تو اس سے کہا ہوتا کہ اس [یعنی مولانا سلیم اللہ خانؒ کی، ناقل] کی کوئی تحریر، کوئی تقریر، کوئی عام نشست کی گفتگو آپ کے ملاحظہ میں آئی ہے؟ اگر آئی ہے تو اسی پر فیصلہ کرلو، مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر یہ کچھ نہیں تو خواہ مخواہ عبث میں مبتلا ہو کر کیوں عاقبت برباد کرتے ہو۔'' واضح کر دیتا ہے کہ معترضین کے پاس اس سلسلے میں زبانی کلامی باتوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ الکلؒ کا محمود احمد عباسی کے افکار کو ''عباسی فتنے'' سے تعبیر فرمانا، اس اتہام سے بری الذمہ ہونے کے لیے کافی ہے۔

شاہ فیصل کالونی میں جامعہ فاروقیہ کی بنیاد ۲۳ رجنوری ۱۹۶۷ء کو رکھی، اس سے قبل وہ اپنے مشفق

اور محبوب استاذ و مربی حضرت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادیؒ کے قائم کردہ ادارے اور اپنی مادرِ علمی جامعہ مفتاح العلوم [جلال آباد- ہند] میں آٹھ سال، پاکستان ہجرت کے بعد دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں تین سال اور دارالعلوم کراچی میں دس سال اور دارالعلوم ہی کے زمانۂ تدریس میں حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ کی خواہش پر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں ایک سال تدریس فرماتے رہے۔ اکیس سال کی تدریس کا یہ طویل زمانہ اتنا مختصر دورانیہ نہیں ہے کہ حضرت مولانا مسیح اللہ خانؒ، حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ ایسے اعتقادی امور میں محتاط اور مسلکی معاملات میں حساس اکابر سے حضرت شیخ الکلؒ کے عقائد اور نظریات پوشیدہ رہیں۔ شیخ الکلؒ پر یہ تہمت و الزام فی الحقیقت متذکرہ تمام بزرگوں کی حمیتِ دینی کو موردِ سوال بنا دیتا ہے کہ یا تو یہ تمام بزرگ غافل تھے، یا پھر مداہن۔ ایسے میں بیرونی حلقوں کے نواصب کی تردید کا کیا سوال خود اِن کے اپنے مدرسوں میں، نعوذ باللہ، ایک ناصبی عالم حدیث، تفسیر، فقہ اور مختلف علوم وفنون کی تدریس فرما رہے تھے۔

اِس کے جواب میں ایک کم زور دلیل یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ حضرت شیخ الکلؒ کا ناصبیت کی طرف میلان جامعہ فاروقیہ کی تاسیس کے بعد ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اِس کی خبر مجہول مکتوب نگار اور فاضل محشی کو تو ہو گئی، لیکن مولانا قاضی مظہر حسینؒ، مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ اور مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، ایسے ردِّ ناصبیت میں معروف اور نہایت ذکی الحس اَصحاب علم وقلم، جن میں سے دو کراچی ہی میں اقامت گزیں اور دن رات تدریس وتصنیف میں منہمک تھے، جنھوں نے نامی گرامی ناصبیوں کی تردید میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا تھا، وہ اِس سے بے خبر اور لاعلم رہے، بہ صورتِ دیگر اِن سب علما کے جذبۂ حب اہل بیت کرامؓ اور اقدامِ سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کی صحت کی غیرت نے انھیں کیوں آمادہ نہیں کیا کہ ایک عالم کراچی ایسے عالمی شہر کے اتنے بڑے مدرسے میں نہ صرف ناصبیت کا پرچار کر رہے ہوں، بلکہ، مکتوب نگار کی تصریح کے مطابق، خلافت راشدہ کانفرنس کے نام سے اپنے مدرسے میں ''بڑے دھوم دھام سے ذکر یزید کروا چکے ہوں''، اس کے باوجود یہ علما ساکت قلم اور مہر بہ لب رہے۔ کیا ان تینوں بزرگوں کا سکوت اِس بات کی دلیل نہیں کہ حضرت شیخ الکلؒ کا دامن ناصبیت کی بدعت سے یک سر پاک تھا؟

ان تمام حقائق سے قطع نظر اگر حضرت شیخ الکلؒ کو ناصبیت سے متہم کرنا فاضل حاشیہ نگار کی بہ ہر صورت منشا تھی تو شرعی اور اخلاقی ذمے داری کا تقاضا تھا کہ حضرت شیخ الکل رحمہ اللہ کی طرف ایک سنگین اعتقادی بدعت کے انتساب کے دعوے کی بنیاد ان کی کسی تحریر، درس، مکتوب یا کم سے کم کسی مصدقہ تقریر کے مستند حوالوں پر رکھی جاتی، ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں تھا، لہٰذا وہ دلیل میں لکھتے ہیں:

''جامعہ فاروقیہ میں باقاعدہ محمود احمد عباسی کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔''(۸)

جس زمانے کی بات کی جارہی ہے، اس وقت جامعہ فاروقیہ میں حضرت شیخ الکلؒ کا ذاتی مکتبہ ''مکتبہ فاروقیہ'' قائم ہی نہیں ہوا تھا، اور مدرسے کے باہر دیگر آزاد کاروباری افراد کے مکتبوں پر اگر اس نوعیت کی کوئی کتاب فروخت ہوتی ہو تو اس کا حضرت شیخ الکلؒ سے کیا تعلق کہ ان پر ناصبیت سے متاثر ہونے کا الزام لگا دیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ جامعہ فاروقیہ اور جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن وغیرہ میں راقم السطور نے خود ایک زمانے میں اسٹالوں پر روافض، نواصب اور بریلویوں کی: حوالوں میں استعمال ہونے والی نایاب کتابیں فروخت ہوتے دیکھی ہیں، بلکہ بعض اوقات اہم کتابیں خود خریدی بھی ہیں۔ ان مدارس کے اربابِ اہتمام کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی کہ ان اسٹالوں پر کون کون سی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ فی الاصل یہ کتابیں بعض مدارس کے باہر اور کہیں احاطے کے اندر اسٹالوں پر ان مذاہب اور مسالک کی ترویج و تائید کے لیے نہیں، بلکہ طلبا اور مناظرین کی تیاری اور مناظروں میں حوالہ جات پیش کرنے کے لیے فروخت ہوتی تھیں۔ مولانا محمد امین صفدر اوکاڑویؒ نے غیر مقلد اکابر کی: حوالوں میں استعمال ہونے والی کئی نایاب کتابوں کے عکسی ایڈیشن نہایت اہتمام سے شائع کروائے تھے، لاہور میں وہ کتابیں مولانا نعیم الدین کے ''مکتبہ قاسمیہ''، مولانا اوکاڑویؒ کے ملک بھر میں منعقد ہونے والے جلسوں اور مختلف مدارس میں ہونے والے دورۂ تدریبیہ میں فروخت ہوتی تھیں۔ کیا اس سے یہ مضحکہ خیز نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا اوکاڑویؒ غیر مقلدیت سے متاثر تھے؟____ جس زمانے کی بات کی جارہی ہے، اس وقت محمود احمد عباسی کی کتابوں پر پابندی تھی اور ان کی خرید و فروخت قانوناً جرم تھا۔ بہت ممکن ہے کہ روافض کی کتابوں کی طرح محمود احمد عباسی کی کتابیں بھی فروخت ہوتی ہوں، لیکن اس سے یہ نتیجہ کشید کرنا کہ جامعہ فاروقیہ میں محمود احمد عباسی کی کتابیں شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کی سرپرستی میں ناصبیت کی ترویج و اشاعت کے لیے فروخت ہوتی تھیں، قرینِ انصاف نہیں۔ حضرت شیخ الکلؒ کا ناصبیت کی طرف عدمِ میلان، بلکہ نفور مخالف نقطۂ نظر کے حامل افراد پر بھی واضح تھا۔ ردِّ ناصبیت میں لکھی گئی ایک کتاب میں محمود احمد عباسی اور ان سے متاثر مولوی حبیب الرحمٰن کاندھلوی کے کی کتاب ''مذہبی داستانیں'' کا تذکرہ کرتے ہوئے ناصبیت اور اس کے ساتھ امیر المؤمنین سیّدنا معاویہؓ کے مشہور ناقد بھی اس امر کے شاہد ہیں کہ حضرت شیخ الکلؒ نواصب سے دیگر علمائے حق کی طرح اختلاف رکھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

''پاکستان کے علما مفتی محمد شفیع مرحوم، ان کے فرزند مفتی محمد رفیع، مولانا یوسف بنوری مرحوم اور مشہور محدث مولانا سلیم اللہ صاحب وغیرہ جو مختلف عربی مدارس یا دارالعلوموں کے سربراہ اور پاکستان کے مسلمہ اور مستند علما ہیں، ان کے یہاں حبیب الرحمٰن کاندھلوی کا کوئی مقام نہ تھا۔''(۹)

اگر حضرت شیخ الکلؒ کا ادنیٰ سا میلان بھی ناصبیت کی طرف ہوتا تو یہ جری ناقد اس کا ذکر ضرور کرتے، لیکن مخالف ہو کر بھی وہ تصریح کر رہے ہیں کہ دیگر علمائے اہل سنت کی طرح حضرت شیخ الکلؒ کے یہاں بھی ناصبیوں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس کے برعکس مجہول مکتوب نگار محمد رمضان میمن اور فاضل حاشیہ نگار دھڑلّے سے حضرت شیخ الکلؒ کو ناصبیت سے متاثر قرار دے رہے ہیں۔

زیر بحث خط میں ناصبی قائدین یا یزیدی ٹولے کے سربراہوں میں پہلا نام مولانا عظیم الدین صدیقی کا شامل کیا گیا ہے، اس ضمن میں مکتوب نگار لکھتے ہیں:

"کورنگی مسجد اقصیٰ میں امام وخطیب ہیں... اس مسجد میں آنے سے قبل یہ جامعہ فاروقیہ میں پڑھاتے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مولانا سلیم اللہ خان کو بھی انھوں نے یزیدی ٹولے کا سربراہ بنا دیا ہے۔"(۱۰)

یہ درست ہے کہ مولانا ابوالحسین عظیم الدین صدیقی کی تعلیم کا زمانہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں (۱۱) اور نظامت کا کچھ عرصہ جامعہ فاروقیہ میں گزرا تھا۔ وہ اس زمانے میں حضرت شیخ الکلؒ کے مخلص رفقا میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے متعلق مکتوب نگار کو بھی اعتراف ہے کہ عظیم الدین صاحب:

"اپنی مسجد اور شہر کے کسی بھی عام جلسے میں اپنے امام "یزید" کی تعریف نہیں کر سکے۔"(۱۲)

کیسی لغو بات ہے کہ جو شخص اپنے مشن کے ابلاغ میں اتنا 'محتاط' یا "بزدل" تھا کہ اپنا مؤقف کبھی سرِ عام بیان نہیں کر سکا، اس نے ایک محدثِ وقت کو "یزیدی ٹولے کا سرکردہ" بنا دیا اور محدثِ وقت نے صبح شام اشتغال بالحدیث اور خود کو بہ تکرار "اکابر دیوبند کا اندھا مقلد" (۱۳) گردانننے کے باوجود یزیدیت کی حمایت اختیار فرمالی۔ انھیں فسق یزید کے باب میں جمہور اہل سنت، اکابر محدثین اور فقہا سے قطع نظر خود اپنے محبوب ترین استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے مؤقف کا پاس رہا (۱۴) اور نہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ [جن کی محبت اور عقیدت کا بیج بچپن ہی میں دل کی نرم سرزمین پر پڑ گیا تھا اور جن کی مبارک صحبت میں حضرت شیخ الکلؒ نے اپنی حیاتِ مستعار کے آٹھ مبارک سال گزارے تھے] کے فتاویٰ (۱۵) کا خیال رہا۔

مکتوب نگار محمد رمضان میمن کی لاعلمی یا خیانت اور حاشیہ نگار کا تجاہل قابل توجہ ہے کہ انھیں یہ بتانا تو یاد رہا کہ مولانا عظیم الدین صدیقی جامعہ فاروقیہ سے وابستہ رہے، لیکن انھیں اس امر کی تحقیق کا خیال کیوں نہیں آیا کہ آخر مولانا عظیم الدین صدیقی جامعہ فاروقیہ کی نظامت سے ترک تعلق کر کے کورنگی میں واقع مسجد اقصیٰ میں کیوں منتقل ہو گئے تھے۔ اس کا اصل سبب جامعہ فاروقیہ ہی کے ایک ذمے دار اور شیخ الکلؒ کے فرزند مولانا عبیداللہ خالد کے قلم سے ملاحظہ کیجیے:

''یہاں [جامعہ فاروقیہ میں] بھی آپ کچھ عرصہ نظامت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد میں باہمی مشاورت سے آپ کورنگی منتقل ہو گئے، اور آہستہ آہستہ جامعہ فاروقیہ سے وہ قریبی ربط، جو ابتداً تھا، باقی نہ رہا۔ پھر مولانا کی فکری سوچ میں بھی کچھ تبدیلیاں آئیں اور مشاجراتِ صحابہؓ کے مسئلے میں مولانا نے مسلک اہل سنت والجماعت کی معتدل راہ کو چھوڑ دیا، جس کے نتیجے میں اہل جامعہ کا وہ قدیمی تعلق جو حضرت مولانا سے ماضی میں رہا تھا، منقطع ہو گیا۔''(۱۶)

رمضان میمن صاحب کا خط ۱۰/ربیع الاول ۱۳۹۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ جس وقت حضرت شیخ الکلؒ پر ناصبیت کا اتہام باندھا جا رہا ہے، اس سے سولہ (۱۶) سال قبل ''شہید کربلا: دعوتِ فکر و عمل'' [کراچی: دارالاشاعت] کے مؤلف مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ انھیں ''فاضل عالم مدرس''(۱۷) قرار دیتے ہوئے امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی کتاب ''مقام أبي حنیفہ'' کے مسودے کا مطالعہ کر کے رائے دینے کے لیے قابل اعتماد جانتے ہوں، کیا وہ شخص ناصبی ہو سکتا ہے؟ پھر حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اپنی کتاب میں حضرت شیخ الکل کو 'عالم علوم نقلیہ و عقلیہ حضرت مولانا محمد سلیم اللہ صاحب دامت معالیہم''(۱۸) قرار دے کر نہایت اہتمام کے ساتھ کیا ایک ناصبی قائد کی تقریظ منیف کو شائع کر کے مطمئن ہوئے تھے؟

اس مکتوب سے دو سال قبل ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء میں شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کو سنی دیوبندی مدارس کے متفقہ اور نمائندہ بورڈ وفاق المدارس العربیہ کی عاملہ کا رکن، ٹھیک دو سال بعد ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۰ء میں ناظم اعلیٰ اور آٹھ سال چھ ماہ بعد ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء میں وفاق المدارس کا صدر منتخب کیا گیا، جس کی صدارت پر حضرت شیخ بالاتفاق تادمِ حیات جلوہ فرما رہے۔ کیا کل سنی دیوبندی مدارس کی سیادت و قیادت، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تمام مسالک کے دینی مدارس کے متفقہ پلیٹ فارم ''اتحادِ تنظیماتِ مدارسِ دینیہ'' کی اوّل اور تاحیات صدارت ایک ''ناصبی قائد'' فرما رہے تھے؟ دیوبندی مدارس کی سند فضیلت ''شھادۃ العالمیۃ'' ایک ناصبی عالم کی توقیع سے جاری ہوتی تھی؟ زمانہ شاہد کہ اپنی صدارت کے طویل عرصے میں حضرت شیخ الکلؒ نے جس ایمانی حرارت کے ساتھ بیرونی حملوں اور سیاسی سازشوں کے بالمقابل جس استقلال سے مدارس کی حفاظت فرمائی، اسی طرح اعتقادی اور مسلکی نوعیت کے مسائل میں بھی انھوں نے کبھی مداہنت یا لچک روا نہیں رکھی۔ اگر مولانا قاضی مظہر حسینؒ نے اپنی تحریر و تقریر سے اہل سنت کو مسلک جمہور سے وابستہ رکھنے کی سعی فرمائی ہے تو شیخ الکل مولانا سلیم اللہ خانؒ نے تحریر و تقریر کے ساتھ ساتھ ادارہ جاتی سطح پر بھی مسلک جمہور کی پوری قوت اور صلابت کے ساتھ حفاظت فرمائی ہے۔ اس عظیم نعمت پر کل سنی

دیوبندی مدارس اور علما حضرت شیخ الکلؒ کے ہمیشہ منت کش رہیں گے۔

۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء میں حضرت شیخ الکلؒ پاکستان میں تحفظ ناموس صحابہؓ کی اوّلین عوامی تحریک ''تحریک سوادِ اعظم اہل سنت'' کے سرپرست اور صدر بنائے گئے، اس سلسلے میں آپ کو اپنے رفقا خصوصاً مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ کے ہم راہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ ناصبیت سیّدنا علیؓ اور اہل بیت اطہارؓ سے بغض و عداوت کا نام ہے۔[19] کیا ناموس اصحاب کرامؓ کے نام پر کراچی کی سرزمین پر پروان چڑھنے والی اس تحریک کے سرپرست اور قائد اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک فردِ فرید اور گل سرسبد امیر المؤمنین سیّدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور راکبِ دوشِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف، نعوذ باللہ، دل میں بوجھ رکھتے تھے؟

دوسرا نکتہ حاشیہ نگار نے یہ بیان فرمایا ہے:

> ''حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ نے مسئلہ فسق یزید اسلاف امت کے صدیوں سے آمدہ خیالات سے اتفاق فرمالیا تھا، جو ان کی کئی مجلدات پر مشتمل کتاب ''کشف الباری شرح صحیح بخاری''[20] میں موجود ہے۔''

حضرت شیخ الکلؒ کی طرف ناصبیت کا انتساب ہی محل نظر اور زبانی و کلامی دعاوی تک محدود ہے۔ ناصبیت کی تائید میں حضرت شیخ کی کوئی تحریر، تقریر یا درس کا حوالہ اب تک موجب طلب ہے۔ اس کے برعکس سیّدنا حسینؓ کے اقدام کی صحت اور یزید کے متعلق حضرت شیخ الکلؒ صاف طور پر فرماتے ہیں:

> ''اہل السنۃ والجماعۃ حضرت حسینؓ اور ان کے مخالفین کو یا ان کی جنگ کو آپس کے مشاجرات میں سے قرار دے کر حضرت حسینؓ کی قربانی کو بے جا یا بے مقصد نہیں قرار دیتے، بلکہ حضرت حسینؓ کو حق کا علَم بردار اور اُن سے جنگ لڑنے کو غلط اور ان کی شہادت کو مظلومانہ شہادت سمجھتے ہیں اور یزید کے اقدام کو غلط مانتے ہیں۔''[21]

نواصب کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مجرم قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

> ''ناصبی عناصر حضرت حسینؓ کی شہادت پر خوشی مناتے ہیں اور انھیں غلط کہہ کر اللہ و رسولؐ کے مجرم بنتے ہیں۔''[22]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''کشف الباری'' فی الاصل حضرت شیخ الکلؒ کے سال ہا سال کے ارشاد فرمودہ درسی اَمالی ہیں۔ اس کی اشاعت سے قبل ملک بھر کے مدارس کے طلبا میں ان دروس کی فوٹو کاپیاں مقبول تھیں۔ طلبا ان سے اپنے امتحانات کی تیاریوں میں استفادہ کرتے تھے۔ اگرچہ ان امالی و دروس کی ترتیب و تدوین اور تبویب و تخریج بعد میں ہوئی ہے، لیکن اس کا بنیادی لوازمہ آپ کے سال ہا سال کے

ارشاد فرمودہ دروس پر مشتمل ہے۔ ''کشف الباری'' بعد میں علیحدہ سے لکھی گئی کوئی تصنیف نہیں ہے، بلکہ انھیں حضرت شیخ الکلؒ کے دروس کی ٹیپ شدہ کیسٹوں سے کاغذ پر منتقل کیا گیا ہے۔ جب کشف الباری میں حضرت شیخ الکل نے مسئلہ فسق یزید میں جمہور اہل سنت ہی کا مؤقف بیان فرمایا ہے تو یہی حضرت شیخ الکلؒ کا اصل مسلک ہے۔ اسے بعد میں ناصبیت سے اتفاق یا رجوع قرار دینا انصاف سے بعید ہے، جب کہ ناصبیت کے فروغ اور یزید کی حمایت میں حضرت کا کوئی مصدقہ حوالہ اَب تک پیش نہیں کیا جا سکا۔

مولانا حمزہ احسانی نے ناصبیت اور فسق یزید سے متعلق حضرت شیخ الکلؒ کے وصال سے قبل ایک عریضہ اِرسال کیا تھا۔ اس کے جواب میں حضرت شیخ نے جو کچھ لکھا تھا، اسے پورا نقل کرنا تو موجب تطویل ہوگا، البتہ اس کے چند جملے حضرت شیخ الکلؒ کے اس ''انتسابی رجوع'' اور ''زبردستی اتفاق'' کی حقیقت واضح کر دیتے ہیں۔ حضرت شیخ الکلؒ لکھتے ہیں:

''یزید کے متعلق میرا نقطۂ نظر بالکل وہ ہی ہے جو ہمارے اکابر کا نقطۂ نظر ہے۔ میں یزید کے فاسق ہونے کے بارے میں کسی تردّد کا شکار نہیں ہوں... حلقۂ اہلِ سنت کو حضراتِ صحابہ کرامؓ کے ساتھ ساتھ حضراتِ اہلِ بیتِ اطہارؓ [جس کے مصداق رسول اللہ صلی اللہ وآلہ علیہ وسلم کی تمام ازواجِ مطہرات، تمام بناتِ طاہرات اور تمام بنین طیبین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں] کے فضائل ومناقب کو پوری سرشاری اور ایمانی جذبے کے ساتھ بیان کرنا چاہیے اور جو لوگ یزید کی مدح وتوصیف بیان کرتے ہیں ان کا راستہ روکنا چاہیے۔''(۲۳)

حضرت شیخ الکلؒ کے وصال سے قبل دار العلوم دیوبند کی ویب سائٹ سے ایک فتویٰ مشتہر ہوا تھا۔ اس فتوے میں یزید کو ''تابعی'' بلکہ ''امیر المؤمنین'' قرار دیتے ہوئے فسق یزید پر اصرار کو تشیع سے متاثر ہونے کی علامت باور کیا گیا تھا۔ اس وقت شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ ہی وہ واحد بزرگ تھے جنھوں نے اپنے ایک مؤقر مکتوب کے ذریعے دار العلوم دیوبند کے اربابِ اہتمام کو اس تسامح کی طرف متوجہ فرمایا تھا۔ حضرت شیخ الکلؒ کے اس مکتوب پر مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندرؒ، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانیؒ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے بھی تائیداً دستخط فرمائے تھے۔ اس مکتوب کے جواب میں مولانا ابو القاسم نعمانی [مہتمم دار العلوم دیوبند] نے حضرت شیخ الکلؒ کی خدمت میں اپنا مکتوب ارسال فرماتے ہوئے تصریح فرمائی تھی کہ دار العلوم کے دار الافتا سے اس نوعیت کے فتوے کا اجرا واقعی جمہور اہل سنت کے نقطۂ نظر سے انحراف ہے، ان شاء اللہ، جلد ہی اس سلسلے میں وضاحت مشتہر کی جائے گی ـــــ راقم السطور ان تمام کاوشوں کا چشم دید گواہ ہے۔

متذکرہ حقائق کے برعکس ایک عظیم محدث، ہزاروں علما اور محدثین کے استاذ وشیخ اور ولی کامل کی

اہانت اور ان پر باندھے گئے اتہام پر مبنی محض شبہات، سوئے ظن اور خرافات سے مملوخط کو حضرت قاضی صاحب سے منسوب مجموعے میں جگہ دینے کا کیا دینی اور اخلاقی جواز تھا؟ جس خط کو حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ نے لائق اعتنا اور جواب دینے کے قابل نہیں سمجھا، اسے قاضی صاحبؒ سے منسوب مجموعے میں جگہ دینا خود قاضی صاحبؒ کے لیے باعث تکلیف ہے۔ خود فاضل محشی کو اعتراف ہے کہ:

”[مکتوب] نگار نے ایک ایسے معروف عالم دین کے متعلق اہانت پر مبنی جو کلمات لکھے ہیں، ان سے خود قائد اہل سنت رحمہ اللہ نے بھی اتفاق نہ کیا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے کسی کتاب، مقالہ یا مضمون میں اس خط میں موجود ان الفاظ کا کہیں بھی حوالہ نہیں دیا۔“(۲۴)

کیا یہ انصاف کی بات ہے کہ جس بزرگ، یعنی حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ، کو خود اپنا ممدوح و محبوب سمجھا جائے، ان کے نام روافض ونواصب کے خطوط کو ”غلاظت کا پلندہ“ اور ان کی اشاعت کو ”کاغذ و قلم کی حرمت کے خلاف طبل جنگ بجانے کے مترادف“ قرار دے کر ان ”تمام خطوط سے غض بصر“(۲۵) فرما لیا جائے اور فخر المحدثین، استاذ المحدثین، مربی و محسن مدارس اور شیخ وقت کے مرتبے و مقام اور ان کے ہزاروں تلامذہ اور لاکھوں متوسلین کی دل آزادی کا کوئی پاس ولحاظ نہ کیا جائے کہ ”اس قبیل کے مکتوب کو پڑھ کر ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟“ جب کہ صورت حال یہ ہو کہ جس شیخ پر یہ اتہام باندھا جا رہا ہے ان کا دامن اس سے یک سر پاک ہے۔ کیا ”صرف قائد اہل سنت رحمہ اللہ کی شخصی عظمت، قائدانہ وجاہت“(۲۶) ہی کی حفاظتِ اہل سنت کا طریق اور خود قائد اہل سنت کی تعلیم ہے؟ مرتب موصوف خطوط کے انتخاب کے متعلق اپنا خوف بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”سب کے سب خطوط شائع کر دینا، ان سے متعلقہ لوگوں کے ہاتھوں اپنا کچومر نکلوا دینے کے مترادف ہوتا۔“(۲۷)

فاضل مرتب و محشی کی بے باکی واقعی باعث حیرت ہے کہ انھوں نے باقی لوگوں کا تو خیال کیا، لیکن شیخ الکلؒ کو ان کے ہزاروں تلامذہ، جن میں بہت سے خود وقت کے اکابر اور مرجع خلائق ہیں، اور لاکھوں متوسلین کی موجودگی میں، نعوذ باللہ، ایسا لاوارث سمجھ لیا ہے کہ وہ جو چاہیں لکھیں اور شائع کریں، کوئی اس پر گرفت نہیں کرے گا؟!

بزرگان اہل سنت کے علمی کاموں میں مسابقت اور مجاہدانہ مساعی میں تنافس کوئی مستحسن رویہ نہیں ہے، تاہم مقطع سخن پر یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے اگر قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کی مختلف النوع دینی خدمات کا انکار حقائق سے چشم پوشی ہے تو شیخ الکل، رئیس المحدثین حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ کی

ہمہ جہت جہد اور مساعی سے صرف نظر بھی دن کو رات کہہ دینے کے مترادف ہے۔ اَذواق وطبائع اور دین اور مسلک حق کی اشاعت وحفاظت کے مختلف میدانوں میں انجام دیئے گئے کارہائے گراں مایہ کے تفاوت کے باوصف ہر دو اکابر کی خدمات اہل سنت و جماعت ہی کے علمی، مسلکی، درسی، تنظیمی اور روحانی دائرۂ کار کے ابلاغ، تحفظ اور توسیع کے ضامن ہیں۔ اِس لیے اپنے ممدوح، استاذ یا شیخ کی جانب التفات کی فراوانی اور محبت کی بے پایاں کشش کے ساتھ تمام بزرگان اہل سنت کی عزت وناموس کا یکساں تحفظ ہی اہل سنت کا منہج ہے۔ ہم ہیچ میرزوں کو تو ہمارے شیخ سیّدی ومولائی حضرت مولانا سلیم اللہ خان قدس سرہٗ نے یہی تعلیم ارشاد فرمائی ہے۔ اِس سلسلے میں حضرت شیخ کا دامن اتنا وسیع اور حوصلہ ایسا بلند تھا کہ وہ اپنے معاصر جید علما کو بھی بلاجھجک ''امام اہل سنت'' اور ''قائد اہل سنت'' ایسے القابات سے یاد فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب عقل سلیم عطا فرماتے ہوئے فکر ومسلکِ سلیم پر قائم ودائم رکھے، کہ اسی میں اہل نظر کے نزدیک حضرت مدنی کی حمیت اور ان کا جمال اور حضرت تھانوی کی احتیاط اور ان کا جلال منعطف تھا۔ مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندرؒ نے بجاطور پر فرمایا ہے:

> ''حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک جامع شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں محبوبیت اور قیادت کے منصب پر فائز فرمایا تھا۔ وہ بلند پایہ محدث، لائق فائق مدرّس، علمائے سلف کے سچے پیروکار اوران کی سیرت کا بہترین نمونہ تھے۔ حق گوئی وبے باکی، غیرت وحمیت اسلامی اور دینی تصلب میں اپنے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی جانشین تھے اور تصوف و سلوک، تزکیۂ باطن، تنظیم اوقات ومعاملات اور ادائے حقوق میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے عین نقش قدم پر تھے۔ آپ مدنی وتھانوی روایات کے امین اور سنگم تھے۔ وفاق المدارس العربیہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے ہم سب کے مقتدا تھے۔''(۲۸)

آخری گزارش اور درخواست:

شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خان نور اللہ مرقدہٗ کی دل آزار اِہانت پر ہم اپنا استغاثہ مولانا قاضی مظہر حسینؒ کے ورثا اور جانشینوں بالخصوص صاحب زادہ گرامی مولانا قاضی ظہور الحسین، مولانا حبیب الرحمٰن سومرو [خلیفہ مجاز مولانا قاضی مظہر حسینؒ] اور مولانا جمیل الرحمٰن [مجاز توبہ حضرت قاضی صاحبؒ] کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرت شیخ الکل کی اہانت اور اُن پر اتہام پر مبنی ایک مجہول شخص کے خط کی اشاعت ہماری طرح متذکرہ تینوں علما کے لیے بھی باعث تکلیف ہوگی۔ قائد اہل سنت مولانا قاضی مظہر حسین کی طرح شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خان بھی اِن کے بزرگ، یکساں واجب الاحترام اور لائق

محبت ہیں۔ دونوں اکابر شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد اور اُن ہی کے وارث تھے۔
اِن علما سے ہماری دست بستہ درخواست ہے کہ حضرت قاضی صاحبؒ کے آثار و شذرات کو یوں فردِ واحد کے انتخاب اور پسند و ناپسند پر نہ چھوڑا جائے، بلکہ اس سلسلے میں حضرت قاضی صاحب کے فکر، ذوق اور مزاج کے حامل اصحاب علم کی ایک مستقل کمیٹی تشکیل دی جائے جو باہمی مشاورت کے بعد فیصلہ کرے کہ کیا شائع کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر کام حضرت قاضی صاحب کی عظیم شخصیت کے لیے نیک نامی کا سبب نہیں بن رہے۔ حضرت قاضی صاحب تو اَب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں، آنے والی نسلیں اِن ہی کتابوں کے آئینے میں اُن کی شخصیت اور اُن کے کام کا تعین کریں گی۔ اس لیے اس سلسلے میں پوری حکمت اور بصیرت کے ساتھ نہایت احتیاط اور کڑے انتخاب کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات:

۱- آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ، لاہور: دار الامین، ۲۰۲۳ء، صفحہ: ۵۰۱ (حاشیہ: ۱)

۲- ایضاً، مکتوب نمبر ۳۲۹، صفحات: ۵۰۱-۵۰۲ ۳- ایضاً، صفحہ: ۵۰۰

۴- مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، ''شیخ الکل حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب قدس سرہٗ، مشمولہ ماہ نامہ ''الفاروق'' کراچی، جمادی الثانی ۱۴۳۸ھ مطابق مارچ ۲۰۱۷ء، جلد ۳۳، شمارہ ۳، صفحہ: ۲۷

۵- آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ، صفحہ: ۵۰۰، حاشیہ نمبر: ۱

۶- یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ''عباسی فتنے سے متاثرین'' اور ''ایک گونا مشن کا اتحاد'' سے مراد کیا ہے؟ سوادِ اعظم اہل سنت کی عوامی تحریک کے زمانے میں ردِ روافض کے بعض جلسوں میں ناصبی خطیب شاہ بلیغ الدین اور ناصبی محقق مفتی طاہر المکی وغیرہ بھی آ جایا کرتے تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ختم نبوت کی عوامی تحریک کے عروج کے زمانے میں نامی گرامی روافض بعض جلسوں اور کانفرنسوں میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں اس حقیقت کا تذکرہ بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مفتی طاہر المکی کے دو صاحب زادگان جامعہ فاروقیہ کے فاضل ہیں۔ ۲۰۱۶ء میں جب راقم کی ملاقات مفتی طاہر المکی سے ان کے گھر پر ہوئی تو انھوں نے حضرت شیخ الکلؒ کے متعلق شدید ناراضی کا اظہار فرماتے ہوئے شکوہ کیا کہ: میری خواہش تھی کے میری اولادیں دورۂ حدیث کی تحصیل مولانا سلیم اللہ خانؒ سے کریں، بڑی تگ و دو کے بعد مولانا راضی ہوئے، لیکن داخلے کو اس امر سے مشروط کیا کہ میرے بیٹے لکھ کر دیں کہ ''ہم اپنے والد کے عقائد پر نہیں ہیں، بلکہ انھیں گم راہ کن سمجھتے ہیں، اگر ہم زندگی کے کسی موڑ پر اپنے والد کے مخصوص عقائد کا پرچار کریں گے تو ہمارے دورۂ حدیث کی سند منسوخ سمجھی جائے گی۔'' جب انھوں نے لکھ کر دیا تب انھیں داخلہ ملا۔

۷- مولانا سیّد عبد القدوس ترمذی، ''شیخ کامل، استاذ المحدثین حضرت مولانا سلیم اللہ خان نور اللہ مرقدہٗ''، مشمولہ ماہ نامہ الحقانیہ، رجب المرجب-شعبان المعظم، ۱۴۳۸ھ / اپریل-مئی ۲۰۱۷ء، صفحات: ۹-۱۰

۸- آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ، صفحہ: ۵۰۰، حاشیہ نمبر ۱

۹- ڈاکٹر سیّد رضوان علی ندوی، خانوادۂ نبویؐ اور عہدِ بنی امیہ: حقائق و اوہام، کراچی: العربی ادارۂ تصنیف و نشر، ۲۰۰۴ء، صفحہ: ۳۹

۱۰- آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ، صفحہ: ۵۰۰

۱۱- قاضی صاحبؒ کے نام اپنے گرامی نامے میں مولانا عبدالرشید نعمانی لکھتے ہیں:

''عظیم الدین تو اس زمانے میں یہاں [بنوری ٹاؤن...ناقل] طالب علم تھا۔'' مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ، مکتوب بہ نام مولانا قاضی مظہر حسینؒ، مشمولہ '' آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ''، صفحہ: ۲۵۴، مکتوب نمبر: ۱۱۳۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان کے شاذ نظریات کی بنا پر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن نے ان کی سندات منسوخ کردی تھیں۔ ۱۲- ایضاً، صفحہ: ۵۰۰

۱۳- مولانا سلیم اللہ خانؒ کا یہ بیان کسی حوالے کا محتاج نہیں۔ حضرت شیخ کا ہر تلمیذ اور ان کے قریب رہنے والا ہر انسان اس بیان سے خوب آگاہ ہے۔

۱۴- یزید کے متعلق مولانا سیّد حسین احمد مدنی کا مؤقف جاننے کے لیے دیکھیے: مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، مکتوباتِ شیخ الاسلام، کراچی: مجلس یادگارِ شیخ الاسلام، ۱۹۹۴ء، جلد ۱، صفحات: ۲۲۸-۲۸۹، مکتوب: ۸۹

۱۵- مولانا اشرف علی تھانویؒ، امداد الفتاویٰ، جلد ۴، صفحات: ۴۶۳-۴۶۵؛ ایضاً، جلد ۵، صفحات: ۴۲۵-۴۲۷

۱۶- مولانا عبید اللہ خالد، ناظمین جامعہ، مشمولہ '' الفاروق''، کراچی، جامعہ فاروقیہ نمبر، جلد ۷، شمارہ: ۸، شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ، صفحہ: ۹۰

۱۷- مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، مقامِ اَبی حنیفہؒ، گوجرانوالہ: مکتبہ صفدریہ، ۱۹۹۶ء، صفحہ: ۲۱ ۱۸- ایضاً، صفحہ: ۲۲

۱۹- النصب: هو بغض عليٍّ وعداوته . محمود بن عمر الزمخشریؒ، الكشَّاف عن حقائق التنزيل وعيون الأقاويل في وجوه التاويل، [تحقیق: عبدالرزاق المہدی]، بیروت: داراحیاء التراث العربی، جلد ۴، صفحہ: ۷۷۷

النصواب: الذين يؤذون أهل البيت بقولٍ أو عملٍ . عبدالحلیم ابن تیمیہؒ، مجموع الفتاوی، [تحقیق: عبدالرحمٰن محمد بن قاسم]، المدينة المنورة، مجمع الملك فهد الطباعة المصحف الشريف، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۵ء، جلد ۳/۱۵۴

۲۰- حاشیہ نگار سے کتاب کا نام نقل کرنے میں تسامح ہوا ہے۔ اردو زبان میں صحیح بخاری شریف کی اس عظیم شرح کا پورا نام ''كشف الباری عما في صحيح البخاري'' ہے۔

۲۱- مولانا سلیم اللہ خانؒ، كشف الباري عما في صحيح البخاري، [ترتیب و تخریج: مولانا عزیز الرحمٰن عظیمی]، ''کتاب فضائل الصحابۃ''، ۲۰۱۲ء، صفحہ: ۷۵۴ ۲۲- ایضاً، صفحہ: ۷۶۳

۲۳- مولانا سلیم اللہ خانؒ، مکتوبِ سلیم: بہ سلسلہ فسقِ یزید، مشمولہ مجلّہ ''صفدر''، لاہور، شمارہ ۵۸، دسمبر ۲۰۱۵ء، صفحات: ۱۵-۱۶

۲۴- آثارِ مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ، صفحہ: ۵۰۱

۲۵- ایضاً، صفحہ: ۱۵ ۲۶- ایضاً، صفحہ: ۱۴ ۲۷- ایضاً، صفحہ: ۱۳

۲۸- مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندرؒ، تعزیتی پیغام، مشمولہ ماہ نامہ ''وفاق المدارس'' ملتان، جمادی الاولیٰ ۱۴۳۸ھ مطابق مارچ ۲۰۱۷ء، صفحہ: ۱۵

مولانا مفتی عبید الرحمٰن، مردان

تکفیر میں تفریط کا پہلو اور اس کے نقصانات

تعارف و اہمیت:

اسلام اور کفر کے درمیان موجودہ حدود کو واضح کرنا اسی قدر اہمیت کا حامل ہے جس قدر خود اسلام اور کفر کا مسئلہ اہتمام کا قابل ہے، اس لیے جس طرح کسی مسلمان کو ''کافر'' قرار دینا کئی مفاسد کا باعث ہے ایسے ہی کسی کافر کو ''مسلمان'' قرار دینا بھی متعدد مفاسد اور متنوع نقصانات کا ذریعہ ہے، یہاں اسی سے متعلق ایک رائج غلطی، اس کے اسباب اور سدّ باب کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اصل مدّعیٰ:

شرعی نقطہ نظر سے جس طرح ''تکفیر مسلم'' حرام، ممنوع اور مذموم ہے، اسی طرح کسی ''کافر کو مسلمان قرار دینا'' بھی حرام، ممنوع اور مذموم ہے۔ مسلمانوں کی عموماً اور اہل علم کی خاص طور پر ذمہ داری ہے کہ دیگر مسائل و احکام کی طرح یہاں بھی خوب احتیاط و دیانت داری سے کام لیں، نہ کسی کافر کو مسلمان کہیں اور نہ ہی کسی مسلمان کو کافر قرار دینے کی جسارت کریں۔ سلف صالحین کے ہاں ایسا ہی رائج تھا۔

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ:

۱:- اسلام و کفر اور مسلمان و کافر کے درمیان فرق کرنا: ضروریات دین میں سے ہے۔

۲:- کسی کو مسلمان یا کافر قرار دینا: دینی احکام میں سے ہے، اور دینی احکام کے بارے میں اہل علم کی حیثیت ''امین'' کی سی ہوتی ہے جو شریعت کی بتائی ہوئی تفصیلات کے مطابق اقدام کرنے کے پابند ہوتے ہیں، ضروری شرعی تعلیمات کے برخلاف تصرف کرنا ''خیانت'' اور ''بددیانتی'' ہے جو قابل مذمت اور لائق نفرت کام ہے۔

۳:- اسلام و کفر کے درمیان دسیوں احکام میں فرق ہے، اب جس طرح کسی مسلمان کو کافر قرار دینے کی صورت میں ان احکام کے اندر خلل لازم آتا ہے، اِسی طرح برعکس صورت میں بھی یہ اختلاط و خلل لازم آتا ہے۔ اِن احکام میں سے بعض کا تعلق حقوق اللہ کے ساتھ ہے اور بعض حقوق العباد کے متعلق ہیں، یہی وجہ ہے جس کی بنیاد پر حضرت علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ وغیرہ بعض محقق اہل علم نے یہ رائے اختیار

فرمائی کہ تاویل کے ممکن ہونے کی وجہ سے کسی شخص کی صراحۃً تکفیر کرنا درست نہ بھی ہو تو بھی وہاں ان احکام کے متعلق اُس پر کفر کے احکام جاری کر لینے چاہئیں جو حقوق العباد کی نوعیت سے ہیں، چنانچہ ''فتاوی شامی'' میں ہے:

(قوله: لا يفتى بكفر مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن) ظاهره أنه لا يفتى به من حيث استحقاقه للقتل ولا من حيث الحكم ببينونة زوجته .وقد يقال: المراد الأول فقط، لأن تأويل كلامه للتباعد عن قتل المسلم بأن يكون قصد ذلك التأويل، وهذا لا ينافي معاملته بظاهر كلامه فيما هو حق العبد وهو طلاق الزوجة وملكها لنفسها، بدليل ما صرحوا به من أنهم إذا أراد أن يتكلم بكلمة مباحة فجرى على لسانه كلمة الكفر خطأ بلا قصد لا يصدقه القاضي وإن كان لا يكفر فيمابينه وبين ربه تعالى، فتأمل ذلك وحرره نقلا فإني لم أر التصريح به، نعم سيذكر الشارح أن ما يكون كفرا اتفاقا يبطل العمل والنكاح، وما فيه خلاف يؤمر بالاستغفار والتوبة وتجديد النكاح وظاهره أنه أمر احتياط. [الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین، کتاب الجہاد، باب المرتد: ۲۲۹/۴]

لیکن ہمارے ہاں ایک عرصہ سے ''تکفیر'' کی مذمت اور حوصلہ شکنی کرنے پر ہی اکتفاء کیا جاتا رہا، دوسرے پہلو کی اہمیت کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہیں مل سکی، اس لیے اس کا فطری نتیجہ یہی ظاہر ہوا کہ ''تکفیر'' کے باب میں ''تفریط'' کی عادت بڑھتی رہی، چنانچہ بہت سے ایسے افراد و جماعتوں کی تکفیر سے بھی پہلو تہی کی جاتی ہے جن کی تکفیر کرنا اُصولی لحاظ سے جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے، اسی طرح بہت سے کفریہ اعمال/اقوال میں بھی بے جا احتمالات نکالے جاتے ہیں، حالانکہ صریح الفاظ وکلمات میں تاویل نکالنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تاویل نکالنا تو درکجا، صاف وصریح کلمات میں اگر خود متکلم بھی تاویل کا دعویٰ کرے کہ میری مراد یہ نہیں، وہ ہے، تو بھی محققین کے نزدیک ایسی بے سروپا تاویلات کا اعتبار نہیں ہے۔

حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ ''شرح شفاء'' میں تحریر فرماتے ہیں:

(قال حبيب بن الرّبيع) ..(لأنّ ادّعاء التّأويل في لفظ صراح) ..(لا يقبل) أي ادعاؤه (لأنّه امتهان) أي احتقار له صلى الله تعالى عليه وسلم (وهو) ..(غير معزّر) بكسر الزاء ..(لرسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم ولا موقّر له) أي ولا معظم لشأنه حيث غير وصفه الخاص به وأراد به حيوانا استحق مهانة (فوجب إباحة دمه) لتقصيره

فی توقیرہ. [شرح الشفا، المقدمۃ: ۳۹۶/۲]

تفریط کے پانچ اسباب اور ان کا ازالہ:

جہاں تک غور وفکر کیا، معلوم ہوا کہ اِس تفریط کے چند بنیادی اسباب ہیں، جن میں سے کچھ اہم اسباب درج ذیل ہیں:

پہلا سبب اور اس کا سدّ باب

۱:–تکفیر کے باب میں بے احتیاطی کی مذمت پر اکتفاء کرتے رہنا۔ یہ بات بلا شبہ درست ہے کہ کسی فرد/ جماعت کی تکفیر میں بے احتیاطی سے کام لینا مذموم وممنوع ہے، لیکن یہ بات (بے احتیاطی کی مذمت) مضر نہیں ہے، جو بات ضرر کا باعث بنتی ہے وہ یہ ہے کہ محض اِسی ایک پہلو پر اصرار کیا جائے، اس کے دوسرے پہلو کو بیان کرنے سے پہلو تہی کی جاتی رہے۔ اور افسوس کہ عملی طور پر بھی ایسا ہی ہوا۔ تکفیر کی مذمت اور اس میں غیر معمولی احتیاط اور چھان بین کی بات تو زیادہ کی جاتی ہے، لیکن ''عدمِ تکفیر'' کے نقصانات ومفاسد کی طرف کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔

سدّ باب:

اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی بھی مسئلہ کی صرف ایک پہلو پر زیادہ زور نہ دیں بلکہ تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر حکم کی تبلیغ وتلقین کرتے رہیں۔ بعض اوقات کسی ایک پہلو ہی میں کوتاہی فروغ پاتی ہے جس کی وجہ سے اسی خاص پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ایسے موقع پر ایک پہلو پر زیادہ زور دینے میں مضائقہ نہیں ہے، بلکہ شرعی مصالح کا تقاضا ہوتا ہے۔ تاہم گاہے گاہے پورا حکم اور اس کے تمام تر پہلوؤں کو اُجاگر کرتے رہنا چاہئے تاکہ امت کے دِل ودماغ میں صرف ایک پہلو ہی راسخ نہ ہونے پائے، دوسرے پہلوؤں کے بالکل نہ رہنے میں متعدد مفاسد ہیں جس کا اربابِ افتاء وتربیت بارہا تجربہ کر چکے ہیں۔

دوسرا سبب اور اس کا سدّ باب

۲:–پروپیگنڈے کا زور۔ قادیانیوں وغیرہ کی تکفیر کے موقع پر خود اُن کے اور اُن کے بہی خواہوں کی جانب سے اس بات کو بہت مشہور کیا گیا کہ: ''مولوی تو بات بات پر تکفیر کرتے ہیں۔'' مختلف طریقوں سے اِس بات کو خوب پھیلایا جاتا رہا اور لوگوں کے ذہنوں میں اِس بات کو بٹھلانے کی کوشش کی گئی کہ مولوی لوگ اگر کسی کی تکفیر کرتے ہیں تو یہ کچھ زیادہ قابلِ توجہ معاملہ نہیں ہے، کیونکہ ان کا تو کام ہی ''کافر بنانا'' ہے۔ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے بھی متعدد افراد وطبقات کے ہاں تکفیر کرنے میں تفریط کی جاتی ہے، خطرہ ہوتا ہے

کہ تکفیر کرنے کی صورت میں پھر پروپیگنڈہ کھڑا ہو جائے گا۔

اس کا سدّ باب یہ ہے کہ اپنے ہوں یا پرائے، کسی بھی طبقے کے پروپیگنڈوں سے بالکل متاثر نہیں ہونا چاہئے، اہل علم کی ذمہ داری: شرعی عمارت کی چوکیداری کرتے رہنے کی ہے، اب چوکیداری کے جو کچھ تقاضے ہوتے ہیں، ان کو بروئے کار لانا ضروری ہے، خواہ کوئی تعریف وتوصیف کرتا رہے یا تردید وتنقید کا شوق پورا کرتا رہے۔ اِن چیزوں کے ساتھ اعتناء رکھنے سے کئی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔

ویسے بھی اِخلاص وللّٰہیت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ کسی کے تبصروں سے صرف نظر کرتے ہوئے شریعت کے مقتضیٰ کے مطابق خاص اللہ تعالیٰ کی رضاء ہی کے لئے آدمی کام کرتا رہے، لوگوں کی طرف توجہ کرنا "کمالِ اخلاص" کے منافی ہے۔ کافر کو کافر سمجھنا اور موقع ہو تو ایسا کہنا: اہل علم کا "فریضہ" ہے، اس میں کوتاہی کرنے کی گنجائش نہیں ہے، جس چیز سے احتراز کرنا ضروری ہے وہ لوگوں کو کافر بنانا ہے، یعنی ایسے اسباب وماحول پیدا کرنا جس کی وجہ سے لوگ کفر کا راستہ اختیار کرلیں، یا یوں ہی مسلمانوں کو بے جا طور پر کافر قرار دینا۔

تیسرا سبب اور اس کا سدّ باب

۳:۔مسلمانوں کی کثرت چاہنا۔ بہت سے لوگ اندیشہ محسوس کرتے ہیں کہ تکفیر کرنے کی صورت میں بہت سے مسلمان کہلانے والے افراد بھی کافر شمار ہوں گے، یوں مسلمانوں کی کثرت متاثر ہوگی، اِس لیے مسلمانوں کو خواہ مخواہ کم کرنے کی کیا ضرورت ہے! ان کی تعداد کو بڑھانے کی فکر کرلینی چاہئے!

سدّ باب: یہ بنیاد ایسی ہے جو علمی تقاضوں سے سراسر دور بلکہ متصادم ہے، اس لیے اس پر کچھ زیادہ بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی اس وقت عام ہو چکی ہے کہ اسلام کو بھی نسلی/قومی تحریک کی طرح مردم شماری کے ساتھ جوڑا جاتا ہے اور اس کی کثرت کا سوچا جاتا ہے، جو لوگ مردم شماری کی حد تک مسلمان شمار ہوتے ہیں، انہی کی تعداد بڑھانے کی تمنا/کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ دین اسلام تو کچھ خاص عقائد ونظریات اور ان پر استوار ہونے والے عمارت کا نام ہے، اگر ان عقائد میں تزلزل آتا ہے تو اسلام برقرار نہیں رہتا، خواہ کوئی اس کا دعویٰ کرتا رہے، محض مردم شماری کے لحاظ سے "مسلمانوں" کی تعداد بڑھانا دین کی حقیقی تعلیمات سے نابلد ہونے کا شاخسانہ ہے، یہ دین کی خدمت کرنے کا راستہ نہیں ہے، بلکہ اس میں اختلاف وتحریف درلانے کا قوی ذریعہ ہے۔

چوتھا سبب اور اس کا سدّ باب

۴:۔بعض اوقات اسی کو "اعتدال" خیال کیا جاتا ہے کہ تکفیر کے معاملے میں بہر حال (بجا اور بے

جا طور پر) تفریط سے کام لیا جائے، ’’تکفیر‘‘ کرنے کو ’’اعتدال‘‘ کے خلاف تصور کیا جاتا ہے۔

سدّ باب: اعتدال جیسے امور اصلاً ’’اُمورِ اضافیہ‘‘ میں سے ہیں، ہر افراط: اپنے سے بڑھے ہوئے افراط کی بنسبت اعتدال معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر تفریط: اپنے سے بڑھ کر دوسری تفریط کی بنسبت اعتدال معلوم ہوتی ہے، اس لیے کسی چیز کو ’’اعتدال‘‘ قرار دینے کا اصل معیار و اساس یہی شرعی دلائل ہی ہیں، لہٰذا اعتدال کا مقام حاصل کرنے کا مناسب و متیقن راستہ یہی ہے کہ شرعی دلیل کا ساتھ دیا جائے۔ اصلاحات سے وابستہ گمراہیوں میں سے ایک عصری گمراہی یہ بھی ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں دو باتوں کے درمیانی بات کرنے کو اعتدال قرار دیا جاتا ہے اور اسی کو سراہا جاتا ہے۔ اہل علم کا شانِ منصبی یہ ہے کہ ان جیسی باریکیوں پر ان کی نظر دقیق و حاوی ہو، ورنہ الفاظ و مصطلحات سے دھوکہ کھانے کے ساتھ دینی حدود و سرحدات کی کماحقّہ حفاظت ممکن نہیں، خاص کر اس پُرفتن دور میں جہاں الفاظ و اصطلاحات بھی فتنوں کا جامہ لیے پھرتے ہیں۔

پانچواں سبب اور اس کا سدّ باب

۵:- کچھ علمی بنیادوں کی وجہ سے بھی تکفیر میں تفریط سے کام لیا جاتا ہے، مثال کے طور پر بعض اوقات یہ بات کی جاتی ہے کہ کسی کو کافر قرار دینے کے لیے ’’سو فیصد یقین‘‘ کا ہونا ضروری ہے، یہ یقین متعلقہ ’’عمل کے کفر ہونے‘‘ کے متعلق بھی ضروری ہے اور متعلقہ شخص یا جماعت سے اس کے ’’صادر ہونے‘‘ میں بھی۔ یعنی جس بنیاد پر تکفیر کی جاتی ہے، اس بنیاد کا کفر ہونا بھی سو فیصد یقینی ہو اور متعلقہ شخص سے اس کام کا صادر ہونا بھی مفتی تک سو فیصد یقین کے ساتھ پہنچ جائے۔

حالانکہ اُصولی لحاظ سے یہ بات درست نہیں، بلکہ غلط فہمی ہے، اس سبب کا علاج کیونکر ہو! اس پر مستقل عنوان کے تحت کچھ ضروری گفتگو کی جاتی ہے۔

اسلاف و اکابر کا مثالی طرزِ عمل

حضرات سلف صالحین اور ان کے طرز پر چلنے والے اکابر اہل علم کا ہمیشہ سے یہی رویہ اور یہی تعامل رہا ہے، تکفیر یا تضلیل کے باب میں انہوں نے پوری بیدار مغزی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے ہاں اس وقت جس چیز کو ’’رواداری‘‘ وغیرہ خوشنما ناموں سے مشہور کیا جاتا ہے، یہ چیزیں ان کے ہاں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ ان کی پوری تاریخ سے اس کی دسیوں مثالیں اکٹھی کی جاسکتی ہیں، حضرت عمر فاروق اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما کے متعدد واقعات سے اس سلسلہ میں پوری رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

حضرت منصور حلاج وغیرہ کے جیسے قضایا کے متعلق بھی متعدد اکابر اہل علم نے اس کی صراحتیں فرمائی ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

”انبیائے کرام کفر کی پوری بیخ کنی کرتے ہیں، وہ کفر کے ساتھ رَواداری اور مصلحت کے روادار نہیں ہوتے، کفر کے پہچان لینے کا بھی ان کو بڑا ملکہ ہوتا ہے، اور اس بارے میں ان کی نگاہ بڑی دُوررَس اور باریک بیں ہوتی ہے، اللہ تعالی ان کو اس بارے میں پوری حکمت اور عزیمت عطا فرماتا ہے، ان کی خداداد فراست اور بصیرت پر اعتماد کیے بغیر چارہ نہیں، دین کی حفاظت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ کفر واسلام کی جو سرحدیں انھوں نے قائم کردی ہیں، اور ان کے جو نشانات انھوں نے مقرر کردیے ہیں۔ ان کی حفاظت کی جائے، اس میں ادنٰی تساہل اور رَواداری دین کو اتنا مسخ کر کے رکھ دیتی ہے جتنا یہودیت، عیسائیت اور ہندوستان کے مذاہب مسخ ہوگئے۔“

مزید لکھتے ہیں:

”انبیاء کے صحیح جانشین بھی اس بارے میں انہی کی فراست وعزیمت رکھتے ہیں، وہ کفر کا ایک ایک نشان مٹاتے ہیں، اور جاہلیت کا ایک ایک داغ دھوتے ہیں، کفر کا ادراک کرنے میں ان کی حس عوام سے بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے، کفر جس لباس میں اور جس صورت میں ظاہر ہو وہ اس کو پہچان لیتے ہیں اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوجاتے ہیں، کہیں ہندوستان جیسے ملک میں بیواؤں کے نکاحِ ثانی کو حرام سمجھنے اور اس سے شدید نفرت رکھنے میں انھیں کفر کی بو محسوس ہوتی ہے، اور وہ اس کو رواج دینے اور اس سنت کو زندہ کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں، اور بعض اوقات اسی پر جان کی بازی لگادیتے ہیں، کہیں قانونِ شریعت پر رواج کو ترجیح دینا اور بہنوں کو میراث نہ دینے پر اصرار کرنا انھیں کفر معلوم ہوتا ہے اور وہ ایسے لوگوں کی مخالفت اور مقاطعہ فرض سمجھتے ہیں، کبھی اللہ اور رسول کا صاف وصریح حکم سن لینے کے بعد اس کو نہ ماننا اور غیر الٰہی عدالت اور غیر الٰہی قانون کے دامن میں پناہ لینا اور غیر اسلامی قوانین واحکام نافذ کرنا، انھیں اسلام سے خروج کے مرادف معلوم ہوتا ہے، اور وہ مجبوری کے عالم میں وہاں سے ہجرت کرجاتے ہیں، کبھی کسی نومسلم کے یا کسی ایسے مسلمانوں کے: جو غیر مسلموں کی صحبت میں رہتے ہوں، اور ان سے متاثر ہوں ایسا ذبیحہ استعمال کرنے سے احتراز کرنے میں اور اس سے نفرت کرنے میں جس سے ان کی ہمسایہ قوم اور ابنائے وطن سختی سے مجتنب رہتے ہیں، (اور ان میں اس کی نفرت اور اس سے وحشت عام ہے،) انھیں ایمان کی کمزوری اور ان کے قدیم مذہب یا غیر مسلموں کی صحبت کا اثر نظر آتا ہے۔“

[دینِ حق اور علمائے ربانی:۸۲،۹۲]

علماء ہند کا ایک امتیازی وصف اور اس کے فوائد

اس باب میں برصغیر پاک وہند کے اہل علم کا ایک امتیازی وصف رہا ہے، وہ یہ ہے کہ ایسے نازک موقع پر بروقت اجتماعی طور پر کوئی فتوی یا فیصلہ صادر فرماتے ہیں، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ:

۱:-عام دینی شعور بیدار ہو جاتا ہے۔

۲:-اہل علم میں اتفاق کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔

۳:-اجتماعیت کی وجہ سے فیصلہ میں قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور معاشرے کے تمام طبقات تک بات پہنچ جاتی ہے۔

۴:-رائے عامہ ہموار ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں متعلقہ فتنے کی خاصی روک تھام ہو جاتی ہے۔

اجتماعی فتاوی تکفیر وتضلیل کے چند نظائر:

مثال کے طور پر ماضی قریب میں:

۱:-قادیانیت نے متعدد کفریہ عناصر کو اختیار کیا، ہزاروں لوگ دھوکہ کھا کر ان کی بات قبول کرنے لگے تو اس وقت اجتماعی طور پر فتوی تیار کیا گیا جس میں متفقہ طور پر ان کو کافر قرار دیا گیا تھا۔

۲:-عبداللہ چکڑالوی اور غلام احمد پرویز وغیرہ جیسے لوگوں نے انکار حدیث کا بیڑہ اٹھایا، اس وقت کئی اہل علم نے بڑی محنت سے اجتماعی فتوی تیار کر کے امت کو اس فتنے سے بچانے میں بڑا مؤثر کردار اَدا کیا۔ اس اجتماعی فتوی کی تفصیل کے لیے حضرت علامہ مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ کی کتاب ''فتنہ انکار حدیث'' ملاحظہ فرمائیں۔

۳:-ایرانی انقلاب کے بعد جب فتنہ رفض وتشیع میں جوش پیدا ہوا، اس وقت بعض باتوفیق اور باہمت اہل علم نے اجتماعی فتوی تیار فرمایا، اس کی تفصیل کے لیے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''ایرانی انقلاب'' اور ''ماہنامہ بینات'' کا اس حوالہ سے خصوصی نمبر ملاحظہ فرمائیں۔

۴:-مسٹر عنایت اللہ خان مشرقی کا فتنہ جب زوروں پر تھا، اس وقت بھی متعدد اہل علم نے اس کی کوشش فرمائی تھی، اور متعدد اہل علم نے فتوی بھی دیا تھا، البتہ وہ فتنہ چونکہ کچھ زیادہ دیرپا نہ تھا، اس لیے زیادہ تحریک کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

۵: وطن عزیز کے بعض علاقے ’’فتنہ آغا خانیت‘‘ کا شکار ہوئے، وہاں اس فتنہ کی روک تھام کے لیے وہاں کے اہل علم نے اجتماعی فتویٰ تیار فرمایا، جس میں اجتماعی طور پر ان کی تکفیر کی گئی تھی۔ اس کی تفصیل کے لیے حضرت مولانا عبید اللہ چترالوی شہید رحمہ اللہ وغیرہ کی مرتب کردہ کتاب ’’آغا خانیت: علماء امت کی نظر میں‘‘ ملاحظہ فرمائیں۔

۶:- بلوچستان وغیرہ کے بعض علاقوں میں ذکری فرقہ کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا اور لوگ اس نام پر دین واسلام سے محروم ہونا شروع ہوئے، تو بھی وہاں کے بعض اہل علم نے یہی طریقہ اپنایا اور ملک وملت کے چنیدہ اہل علم سے اس سلسلہ میں ان کے کافر ہونے کے فتاوی حاصل کیے، اس کی کچھ تفصیل کے لیے کتابچہ ’’ذکری خارجِ اسلام ہیں‘‘ ملاحظہ فرمائیں۔

۷:- جاوید احمد غامدی کی تحریرات میں شروع ہی سے زیغ وضلال کا بیج محسوس کیا جاتا رہا ہے، ایک عرصہ بعد جب گمراہی واضح ہوئی اور لوگ بھی اس سے متاثر ہونا شروع ہوئے تو ماضی قریب میں بعض باہمت نوجوان علماء کرام نے بڑی ہمت وجرأت کے ساتھ یہی کوشش فرمائی اور ملک بھر کے اکابر علماء سے اس سلسلہ میں متعدد اہم تحریرات وفتاوی حاصل کیے، جن میں اس کو واضح طور پر گمراہ کن شخص قرار دیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے ’’مجلّہ صفدر‘‘ کا خصوصی نمبر بنام ’’فتنہ غامدی نمبر‘‘ ملاحظہ فرمائیں۔

تکفیر کے لیے تیقن ضروری ہونے کا قضیہ:

بہت سے افراد وطبقات میں تکفیر کے حوالہ سے تفریط کی ایک بنیاد یہ ہے کہ وہ تکفیر کے درست ہونے کے لیے یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ جس چیز کی بنیاد پر کسی فرد/ جماعت کی تکفیر کی جاتی ہے، وہ اس سے یقینی طور پر صادر ہو، اگر مفتی کو قطع ویقین کے ساتھ اس کی خبر نہ پہنچے تو اس کے لیے تکفیر کرنا درست خیال نہیں کرتے، اس لیے وہ بہت سے مواقع میں تکفیر کرنے میں تساہل سے کام لیتے ہیں، اگر چہ وہاں شرعی اُصول کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ متعلقہ شخص/ جماعت کی تکفیر کی جائے۔

یہ تصور درست نہیں ہے، تکفیر کے باب میں بلا شبہ احتیاط سے کام لینا چاہئے، شرعی احکام کے انطباق میں عجلت پسندی اور جلد بازی سے کام لینا ویسے بھی پسندیدہ حرکت نہیں ہے، تکفیر کے باب میں خاص طور پر اس کا لحاظ رکھ لینا چاہئے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس کے لیے خواہ مخواہ کی ایسی شرائط لگائی جائیں جس سے تکفیر کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔

ضابطہ کی بات یہ ہے کہ تکفیر بھی دیگر احکام کی طرح ایک ''معاملہ'' ہے جس کے ساتھ متعدد احکام وابستہ ہیں، اب جس طرح دیگر احکام کے انطباق کے لیے ہر موقع پر ''یقینی علم'' کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ''غالب گمان'' کے مطابق بھی حکم منطبق کرنا درست ہے، اسی طرح تکفیر کے معاملہ میں بھی ہر جگہ سو فیصد یقین کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ غالب گمان پر بھی اس کی بنیاد رکھنا درست ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی ایسے امر کا مرتکب ہے جس کا کفر ہونا یقینی ہوتا ہم شخص مذکور/ جماعت کا اس امر کا ارتکاب کرنا متیقن نہ ہو بلکہ غالب گمان سے ثابت ہو تو بھی اس کی تکفیر کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کی تحقیق

امام غزالی رحمہ اللہ اس موضوع پر اپنے ایک مفید رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں:

ولا ينبغي أن يظن أن التكفير ونفيه ينبغي أن يدرك قطعاً في كل مقام، بل التكفير حكم شرعي يرجع إلى إباحة المال، وسفك الدم، والحكم بالخلود في النار، فمأخذه كمأخذ سائر الأحكام الشرعية، فتارة يدرك بيقين، وتارة بظن غالب، وتارة يُتَرَدَّدُ فيه، ومهما حصل تردد فالتوقف فيه عن التكفير أولى.

[فيصل التّفرقة بين الإسلام والزّندقة:٦٠]

اس سے واضح ہوا کہ جہاں تکفیر سے باز رہنا مناسب ہے، وہ وہ صورت ہے جہاں کفریہ امر کے صادر ہونے میں ''شک وتردّد'' ہو، جہاں غالب گمان یا یقین ہو، وہاں باز رہنا مناسب نہیں ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ اپنی ایک دوسری مفید اور معتمد کتاب ''الاقتصاد'' میں تحریر فرماتے ہیں:

اعلم أن للفرق في هذا مبالغات وتعصبات...فإذا أردت أن تعرف سبيل الحق فيه فاعلم قبل كل شيء أن هذه مسألة فقهية، أعني الحكم بتكفير من قال قولاً وتعاطى فعلاً، فإنها تارة تكون معلومة بأدلة سمعية وتارة تكون مظنونة بالاجتهاد.

[الاقتصاد في الاعتقاد للغزالي،الباب الرابع بيان من يجب تكفيره من الفرق:١٣٣]

علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی تحقیق:

علامہ انور شاہ کشمیری صاحب رحمہ اللہ، مختلف اہل علم کی عبارات کو جمع کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

يريدون أن الحديث إذا كان خبر واحد يصلح مأخذاً ومبنى لمسألة التكفير في حق المفتي، وأما الرجل المكفر اسم مفعول، فإنما يكفر في نفسه بإنكار القطعي لا

بإنكار الظني، وذلك في حقه، وأما المفتي فيكفي في حقه ظنه بأن فلاناً أنكر قطعياً، ولا يجب له القطع ..والحاصل أن الموجب لكفر الرجل في نفسه هو إنكار قطعي، وأما الموجه والمنبه للمفتي في مسألة تكفيره قد سكون حديثاً آحادياً فينبهه على أن إنكار أمر كذا كفر، ثم لا يكون ذلك الأمر في الواقع إلا قطعياً.

[إكفار الملحدين في ضروريات الدين:٦٧]

اسی کتاب میں ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

مأخذ التكفير أي دليله الذي أخذ منه وبني عليه قد يكون ظنياً ونظيره العمل بالظن في حالة الجهاد إذا تردد في شخص أهو مسلم أم لا؟ ولا ينبغي أن يظن أن التكفير ونفيه ينبغي أن يدرك قطعاً في كل مقام .بل التكفير حكم شرعي، يرجع إلى إباحة المال، وسفك الدم، والحكم بالخلود في النار، فمأخذه كمأخذ سائر الأحكام الشرعية، فتارةً يدرك بيقين وتارة يظن غالب وتارةً يتردد فيه، ومهما حصل تردد فالوقف فيه عن التكفير أولى." فيصل التفرقة."[إكفار الملحدين:١١٦]

خلاصہ تحریر:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ:

۱:-تکفیر کے بارے میں جس طرح افراط کرنا اور بات بات پر کسی فرد/ جماعت کو کافر ٹھہرانا: ناجائز، مذموم اور لائق اجتناب اقدام ہے، اِسی طرح اس سلسلہ میں تفریط کرنا اور ضابطہ کے مطابق کافر قرار پانے والے افراد/ جماعتوں کو کافر قرار دینے/ کہنے سے رکے رہنا بھی: ناجائز، مذموم اور غلط کام ہے، جس سے گُریز کرتے رہنا ضروری ہے۔

۲:-ہمارے ہاں جس طرح تکفیر کے باب میں بعض اوقات افراط سے کام لیا جاتا رہا ہے اور اَب بھی لیا جاتا ہے، اِسی طرح تفریط کا ارتکاب بھی ماضی وحال میں رائج ہے۔

۳:-تکفیر کے باب میں تفریط کے چند اہم اور نمایاں اسباب ہیں جن پر سابقہ سطور میں گفتگو ہو چکی ہے، ان اسباب کا ازالہ کر لینا چاہیے۔

والله تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ناکارہ عبید الرحمٰن، مردان۔ ۲ر رمضان ۴۵ھ

☆......☆......☆......☆

مولانا مجیب الرحمٰن،ڈیرہ اسماعیل خان قسط:۱۲

غامدی صاحب کے مزعومہ اجتہادات پر ایک نظر

غامدی نظریہ جہاد

اِسی اصولِ ’’اتمامِ حجت‘‘ کا حصہ غامدی کا نظریہ جہاد ہے،اس بارے میں غامدی صاحب نے کافی تفصیل سے لکھا ہے،ہم اُس لمبی تفصیل میں نہیں جاتے،اُس نظریہ کا خاص واہم حصہ اورخلاصہ یہ ہے:

’’لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرینِ حق کے خلاف جنگ اور اُس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے اُنہیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اِس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے،قیامت تک کوئی شخص اَب نہ دنیا کی کسی قوم پر اِس مقصد سے حملہ کرسکتا ہے،اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کرسکتا ہے،مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے،اور وہ ظلم وعُدوان کے خلاف جنگ ہے،اللہ کی راہ میں قتال اَب یہی ہے،اِس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جاسکتی۔‘‘[میزان:۵۹۹]

اِس کا مطلب یہ ہوا کہ:

(۱)مسلمانوں کو دفاعی جہاد کی اجازت ہے،اَب اقدامی جہاد کی اجازت بالکل نہیں ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ نے جہاں تک اِتمامِ حجت کیا ہے،اور حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اُن سے اِقدامی جہاد کیا ہے،بس وہی جہاد درست تھا،اُس کے بعد کے لیے کوئی شخص،حکومت اِقدامی جہاد کی مجاز نہیں ہے۔

آگے چلنے سے پہلے سمجھ لیں کہ غامدی صاحب کے نظریہ میں عرب،مشرکینِ مکہ،اور اُس وقت کے یہود ونصاریٰ پر اتمامِ حجت ہوچکا تھا،اس لیے اُن سے اقدامی جہاد درست تھا،ایسے ہی جزیرہ نما عرب سے باہر کے جن لوگوں اور بادشاہوں تک نبی کریم ﷺ نے خطوط لکھے تھے،اُن خطوط کے ذریعے اُن پر بھی محض خطوط پہنچنے سے اتمامِ حجت ہوگیا ہے،جن کو آپ ﷺ نے خطوط لکھے ان سربراہوں کے نام یہ ہیں ا:نجاشی شاہ حبش،۲:مقوقس شاہ مصر،۳:خسرو پرویز شاہ فارس،۴: قیصر شاہ روم،۵: منذر بن ساوی حاکمِ بحرین،۶: ہوذہ بن علی صاحبِ یمامہ،۷: حارث بن ابی شمر حاکمِ دمشق،۸: جیفر شاہ عمان۔[میزان حاشیہ،صفحہ:۵۹۹]

غامدی صاحب کی سوچ کے مطابق نبی کریم ﷺ کے خطوط اتمامِ حجت کا سبب ہیں لیکن قرآن

وسنّت اور امت کے ذریعے دنیا تک پہنچنے والا اسلام کا پیغام اتمامِ حجت کا ذریعہ نہیں،تو معلوم ہوا کہ اہل عجم میں سے اتمامِ حجت صرف حبشیوں ،ایرانیوں،رومیوں ،اہل بحرین ، یمامیوں ،دمشقیوں اور اہل عمان پر ہوا ہے،اِن کے سوا پر اتمامِ حجت نہیں ہوا،اور جب غامدی صاحب کے خیال میں جن پر اتمامِ حجت ہوا اُن سے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو جہاد کیا بس وہی حق جہاد تھا،تو مطلب یہ ہوا کہ اِن مُلکوں اور شہروں کے سوا نہ کسی پر اتمامِ حجت ہوا، نہ اُن سے جہاد جائز تھا،تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین وتبع تابعین رحمہم اللہ کے وہ جہادی معرکے بھی ناحق ہوں گے جو اِن مُلکوں وشہروں کے علاوہ باقی دنیا کے انسانوں کے ساتھ پیش آئے ،مثلاً:

اُردن اور اُس کے آس پاس کے علاقے (خلافتِ صدیقی وفاروقی)فلسطین (خلافت صدیقی) قبرص (امارت سیدنا معاویہ) اندلس (امارت عبدالعزیز بن مروان) قادسیہ، مدائن، نہاوند، اصبہان، آذربائیجان (خلافت فاروقی)افغانستان وملحقات (امارت معاویہ)سندھ، ہند، کے متعدد علاقے (امارت معاویہ،وغیرہ)وغیرہ

یہ علاقے صحابہ رضی اللہ عنہم ،تابعین رحمہم اللہ کے دوروں میں فتح ہوئے ،اور اِن علاقوں تک یہ مجاہدین تو آئے ہیں ،لیکن نبی کریم ﷺ کے خطوط نہیں پہنچے تو اُن پر اتمامِ حجت ہوا یا نہیں؟ اگر ہوا تو کیسے؟ محض مسلمانوں کا پہنچ کر دعوتِ اسلام دینا اتمامِ حجت کے لئے کافی ہے تو پھر آپ کے نظریہ اتمامِ حجت کی دھجیاں بکھر گئیں ،اور اگر صحابہ،تابعین نے اتمامِ حجت نہ ہونے کے سبب اِن اہل بلاد سے جہاد نہیں کیا تو کیا فساد کیا؟ ذرا کُھل کر ارشاد فرمایئے گا،تو اگر یہ فساد ہے تو ہم مسلمانوں کو خدا اور سول کا حکم ہے کہ اِن فسادیوں کی اتباع واقتداء کرو،اِسی فساد میں نجات ملے گی،آخرت میں کامیاب ہوگے،اور اگر یہ فساد نہیں تو آپ کے نظریہ اتمامِ حجت کے مطابق جہاد بھی نہیں،تو وہ کیا ہے جو نہ فساد ہے نہ جہاد ہے؟

لہٰذا جناب کا نظریہ بالکل غلط ہے،یہ حرمین سے نہیں آیا کہیں مغرب سے اور قادیان سے آیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی پیشین گوئیاں کہ مسلمان جہاد کرتے رہیں گے۔

اِس بارے میں حضور نبی کریم ﷺ نے بہت سی اقوام سے بہت سے جہادی معرکوں کی پیشین گوئیاں فرمائی ہیں ،اور ایسے کئی معرکوں کی فضیلتیں بھی بیان فرمائی ہیں ،حالاں کہ وہ ایسی اقوام ہوں گی جن تک صرف نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے دین کی باتیں تو پہنچی ہوں گی ،مگر آپ ﷺ کے خطوط ،یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں پہنچے ہوں گے،اگر وہ معرکے جہاد نہ ہوتے ،اور فساد ہوتے تو آپ ﷺ اِس بارے میں ضرور امت کو سمجھاتے ، یہ آپ کے فرضِ منصبی کا حصہ تھا،مگر آپ ﷺ نے اُن سے روکا نہیں ، بلکہ شرکت کی

ترغیب دی ہے، جس سے معلوم ہوا وہ جہادی معرکے واقعی جہاد ہوگا، جس سے غامدی صاحب کے نظریہ اتمامِ حجت کے سب نتائج غلط ہونا واضح ہوتا ہے۔

احادیث غزوہ ہند:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

وعدنا رسولُ الله ﷺ غزوة الهند فان ادركتُها اُنفق فيها نفسي ومالي ،فان اقتل كنتُ من افضل الشهداء وان ارجع فانا ابو هريرة المحرر(سنن النسائی المجتبی ۶/ ۴۲، السنن الكبرى للبيهقي ح ۱۸۵۹۹ ، سنن سعيد بن منصور ۲/ ۱۴۵ ،رقم ۲۳۷۴، الجهاد لابن ابی عاصم ح ۲۹۱ ،مسند البزار ۹۸۸۱،مستدرک ۶۱۷۷) رسول اللہ ﷺ نے ہم سے غزوہ ہند کا وعدہ دیا ہے (کہ ہوگا) اگر میں نے اُس کو پا لیا تو میں اپنا جان و مال اُس میں خرچ کردوں گا، پھر اگر میں شہید ہوا تو افضل شہداء میں سے ہوں گا، اور اگر میں سلامت واپس آیا تو میں دوزخ سے آزاد ابو ہریرہ ہوں گا۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ مولیٰ رسولِ اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عصبتان من امتی احرزهما الله من النّار عصبة تغزو االهند،وعصبة تكون مع عيسى بن مريم عليهما السلام (سنن النسائی بسند جيد ۶/ ۴۳، الجهاد لابن ابی عاصم ح ۲۸۸، المعجم الاوسط ح ۶۷۴۱، احمد ۲۲۳۹۶) میری امت کے دو لشکروں کو اللہ تعالیٰ جہنم سے آزاد کرے گا، ایک وہ لشکر جو ہند سے جہاد کرے گا، دوسرا وہ لشکر جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جہادی معرکوں میں شامل ہوگا۔

غزوہ ہند کی یہ احادیث ظاہر کرتی ہیں کہ ہندوستان سے جو یہ لڑائی ہوگی، یہ واقعی جہاد ہوگا، اور افضل جہادی معرکوں میں سے ہوگا، اُس میں شرکت مجاہدین کے لئے بڑی سعادتوں میں سے ہوگی، کہ اگر شہید ہوئے تو افضل شہداء میں سے ہوں گے، اور اگر سلامت واپس ہوئے تو جہنم سے آزاد اور جنتی ہوں گے، تو اگر سوائے ظلم و عدوان کے اقدامی جہاد ختم ہو گیا ہے تو اِن مجاہدین کا جہاد اور وہ بھی اتنی فضیلت والا کیسے ہوگا؟ معلوم ہوا کہ غامدی کا اُصول اتمامِ حجت بھی بالکل بے اصل ہے، اور اُن کا نظریہ جہاد بھی بالکل بے ثبوت ہے، اور واقعۃً بے ثبوت ہے، یہ مرزائیوں کی تائید میں ایسے نظریات الاپ رہے ہیں، جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں دو الگ الگ جماعتوں کا ذکر آیا، ایک غزوہ ہند کے

مجاہدین کا لشکر، دوسرا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھی۔ اِس انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِس غزوہ ہند کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جہادی معرکوں سے پہلے کا ہے، اور یہ معرکہ اُن کے معرکوں سے الگ ہے، لہٰذا دونوں سے ایک جماعت مراد لینا درست نہیں، بلکہ یہ دو الگ الگ جماعتیں ہیں۔

امام ابن کثیر دمشقی رحمہ اللہ (م ۷۷۴ھ) حدیث غزوہ ہند لکھ کر فرماتے ہیں

وقد غزا المسلمون فی سنة اربع واربعین فی امارة معاویة بن ابی سفیان رضی الله عنه ....وقد غزاها الملک الکبیر السعید المحمود بن سبکتکین صاحب بلاد غزنة وما والاها فی حدود اربعمائة ....وقد کان نواب بنی امیة یقاتلون الاتراک فی اقصی بلاد السند والصین (النهایة فی الفتن والملاحم :۱/۱۸،البدایة: ۶/۲۴۹) مسلمانوں نے سنہ ۴۴ھ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی حکومت کے زمانہ میں ہند سے جہاد کیا تھا۔۔۔ اور چوتھی صدی میں نیک نصیب بادشاہِ کبیر سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ نے بھی ہند سے جہاد کیا ہے۔۔۔ ایسے ہی بنو امیہ کے بڑے سندھ اور چین کے شہروں میں ترک (انگریز) فوجیوں سے لڑتے رہے ہیں۔

مولانا محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ (م ۱۳۴۸ھ) فرماتے ہیں:

امام نسائی نے یہ حدیث سنن میں درج کی ہے، اور نسائی سنہ ۳۰۳ھ کو فوت ہوئے ہیں، تو ہند پر پہلا حملہ سنن نسائی کی نشر واشاعت کے زمانہ کے بعد سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ نے سنہ ۳۹۳ھ کو کیا ہے، ہند مسلمانوں کی کتابوں میں ''نہر اتک'' کا نام ہے، اسی کے سبب ''اتک'' کے پیچھے رہنے والوں کو ''ہندو'' کا نام دیتے ہیں، اور اسی لئے انگریز نے ہند کا نام اپنی زبان میں ''انڈیا'' رکھا، اس لحاظ سے حدیث اُس غزوہ ہند پر صادق آتی ہے جس میں ''نہر اتک'' پار کی جائے گی۔ (رحمۃ للعالمین، عربی، صفحہ: ۷۴۸)

تُرکیوں سے معرکے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاتقوم الساعة حتی یقاتل المسلمون التُرکَ، قوماً وجوههم کالمجانّ المطرقة یلبسون الشعر ویمشون فی الشعر. (سنن النسائی المجتبی ۶/۴۵، ابوداؤد ۴۳۰۳، ابن حبان ح ۶۷۴۵) قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ مسلمان تُرک قوم سے لڑیں گے، یہ ایسے لوگ ہوں گے جن کے چہرے تہ بہ تہ کمان کی طرح ہوں گے، وہ بالوں والا لباس پہنیں گے، اور بالوں والے جوتے پہنیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاتقوم الساعة حتی تقاتلوا خوزا و کرمان من الاعاجم ،حمر الوجوه ،فطس الانوف صغار الاعین وجوههم المجان المطرقة نعالهم الشعر (الجمع بین الصحیحین ۱۵/۳ ،ح ۲۱۷۹ ،بخاری ،مسلم) قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم (مسلمان) خوزا اور کرمان کے عجمیوں سے قتال کروگے،اُن کے چہرے سرخ ،ناک بچھے ہوئے ،آنکھیں چھوٹی ہوں گی ،اُن کے چہرے تہ بہ تہ کمان جیسے ہوں گے،اُن کے جوتے بالوں کے ہوں گے۔

خوزا،کرمان ترک قوم کا حصہ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے حسن سند کے ساتھ حدیث نقل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الدجال یخرج من ارض المشرق یقال لها خراسان ،یتبعه اقوام کانّ وجوههم المجان المطرقة (ترمذی ۲۲۳۷) دجال مشرق کی سرزمین خراسان سے ظاہر ہوگا،اُس کے پیروکار کچھ ایسے لوگ ہوں گے جن کے چہرے تہ بہ تہ کمان کی طرح کے ہوں گے۔

اوپر ترک ،خوزا،کرمان کے لوگوں کے حلیہ میں بھی یہی چیز ذکر ہوئی ،جس سے سمجھ یہ آتا ہے کہ شاید اِن قوموں سے لڑائی دجال کے ظہور کے وقت ہوگی ،واللہ اعلم ،کچھ حضرات لکھتے ہیں کہ تُرک اور اِن قوموں سے لڑائی سابق زمانہ میں ہوچکی ہے،ممکن ہے کہ سابق زمانہ کی لڑائی بھی مراد ہو،اور دجال کے ظہور کے وقت بھی ایسے لوگ اُس کے ساتھ ہوں،تو اُس وقت بھی اُن سے لڑائی ہو۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ (م ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

ان الترک قاتلهم الصحابة فهزموهم وغنموهم وسبوا نساء هم وابناء هم وظاهر هٰذا الحدیث یقتضی ان یکون هٰذا من اشراط الساعة ،فان کانت اشراط الساعة لاتکون الا بین یدیها قریبا فقد یکون هٰذا ایضاً واقعاً مرة اخری عظیمة بین المسلمین وبین الترک حتی یکون آخر ذالک خروج یأجوج ومأجوج ....وان کانت اشراط الساعة اعم من ان تکون بین یدیها قریباً منها،فانها تکون مما یقع فی الجملة ولو تقدم قبلها بدهر طویل ،الا انه مما وقع بعد زمن النبی ﷺ (النهایة فی الفتن والملاحم :۲۰/۱)

ترک سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاد کیا ہے،اُن کو شکست دی،اموال غنیمت حاصل کئے،اُن کی عورتوں بچوں کو قیدی بنایا،حدیث کا ظاہر اِس کا مقتضی ہے کہ یہ علاماتِ قیامت میں سے ہو،تو اگر قیامت کے بہت قریب کی علامات میں سے ہو تو پھر یہ معرکہ آئندہ واقع ہوگا جس کی انتہاء یاجوج ماجوج کے خروج پر ہوگی ،اور عام علاماتِ قیامت میں سے ہو تو اِس معرکہ کا کبھی نہ کبھی وقوع ہونا ہے چاہے اب سے بہت پہلے ہو چکا

ہو، مگر اس کا وقوع نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے بعد ہے۔

مولانا محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

کہ ان حدیثوں میں فتنہ تاتار کی خبر دی گئی ہے، ہلاکو خان کے لشکروں نے خراسان، عراق کو برباد کیا، بغداد کو لوٹا، پھر آسیا صغرای میں سخت شکست کھائی، یہ واقعات سنہ ۶۰۶ ھ میں ہوئے ہیں۔
(رحمۃ للعالمین عربی صفحہ: ۷۴۹)

بہرصورت یہ بھی جہاد ہوگا نہ کہ فساد۔

دجال کے پیرو یہودیوں سے قتال:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تقاتلون الیھودَ حتّٰی یختبیء احدھم وراء حجر فیقول یاعبداللہ ھذایھودیّ ورائی فاقتلہٗ (بخاری: ۴/۵۱، مسلم: ۲۹۲۱/۷۹، السنن الواردۃ فی الفتن للدانی: ۴۴۹، مسندالبزار: ۵۵۲۷، الشریعۃ آجری: ۸۹۰) تم (میری امت والو) یہود سے جہاد کروگے، یہاں تک کہ یہودی پتھر کے پیچھے چھپے گا، تو پتھر کہے گا اے اللہ کا بندہ! یہ یہودی میرے پیچھے ہے، اس کو قتل کر۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کے الفاظ ہیں:

لاتقوم الساعۃ حتی تقاتلوا الیھود حتی یقول الحجر وراءہ الیھودی یامسلم ھذا یھودی ورائی فاقتلہ (بخاری ۲۹۲۶، مسلم ۲۹۲۲/۸۲، احمد ۷۲۱۹، ۹۳۹۸) قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم (میرے امتی) یہودیوں سے لڑو گے، یہاں تک کہ وہ پتھر جس کے پیچھے یہودی ہوگا بولے گا کہ اے مسلمان! یہ میرے پیچھے یہودی ہے، اس کو قتل کر۔

یہ حدیثیں قیامت قائم ہونے کے بالکل قریب دجال کے ظہور کے وقت کی ہیں، یہ الفاظ بخاری شریف کے ہیں، دوسری کتبِ حدیث میں کہیں اجمال کے ساتھ اور کہیں تفصیل کے ساتھ یہ مضمون متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قتال قیامت قائم ہونے کے بہت قریب ہوگا، جب یہود ونصاری دجال کے ساتھ ہوں گے، اور مسلمانوں کے امیر وسپہ سالار حضرت سیدنا عیسی علیہ السلام ہوں گے۔

یہ مضمون حضرت ابوامامہ باہلی (الفتن ۱۵۸۹، ابن ماجہ ۴۰۷۷)، حذیفہ بن الیمان (الفتن ۱۵۹۱، المستدرک ۸۵۰۷) عبداللہ بن عمرو (الفتن ۱۵۹۵، ابن ابی شیبۃ ۳۷۴۹۴)، جابر بن عبداللہ (مسند احمد ۱۴۹۵۳) سمرہ بن جندب (احمد ۲۰۱۷۸) حذیفہ بن اسید (المستدرک ۸۶۱۲) ابن مسعود (السنن الواردۃ فی الفتن)، رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے،

ظاہر ہے کہ غامدی صاحب کی سوچ کے مطابق اِن یہود پر اتمامِ حجت نہیں ہوا،مگر مسلمان اُن سے جہاد کریں گے(ممکن ہے کہ غامدی نظریات رکھنے والے اُن مسلمانوں میں شامل نہ ہوں کیوں کہ اتمامِ حجت نہ ہونے کے سبب یہ تو اُس جہاد کے مخالف ہیں)اُن مسلمانوں کے جہاد کے حق ہونے کی صاف دلیل اللہ تعالی کی اِس نصرت کا اُن کے ساتھ ہونا ہے کہ درخت اور پتھر مسلمانوں کے لئے یہود کے خلاف جاسوسی کریں گے،اور یہ کہ مسلمان فاتح ہوں گے،یہود و نصاریٰ بمع دجال مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوں گے ان شاء اللہ!

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے جہادی معرکے:

حضرت حسن سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انا اولی الناس بعیسی ابن مریم ،انه لیس بینی وبینه نبی ،وانّه نازلٌ لامحالة، .... ،فیکسر الصلیب ،ویقتل الخنزیر ویقاتل النّاس علی الاسلام فیهلک الله عزوجل فی زمانه الملل کلها غیر الاسلام ،وحتی تقع الامنة فی الارض ،وحتی یرتع الاسد مع الابل والنمور مع البقر،والذئاب مع الغنم ویلعب الصبیان بالحیات لایضر بعضهم بعضاً (السنن الواردة فی الفتن لعثمان بن سعید الدانی م ۴۴۴ھ،۶/۱۲۳۳،رقم:۶۸۴،جزء اشراط الساعة لعبدالملک بن حبیب قرطبی م ۲۳۸ھ رقم ۳۴،صفحه ۱۵۲) میں سب لوگوں کی بہ نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قریب ہوں، میرے اور اُن کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے،اور وہ ضرور اتریں گے،وہ صلیب توڑ دیں گے،خنزیر کو ماردیں گے،اور اسلام کے لئے لوگوں (کافروں) سے جہاد کریں گے،تو اُن کے دور میں سوائے اسلام کے اللہ تعالی سب مذاہب کو ختم کردے گا،زمین پر امن وسکون ہوگا،شیر اونٹوں کے ساتھ،چیتے بیلوں کے ساتھ،بھیڑیئے بکریوں کے ساتھ چریں گے،بچے سانپوں سے کھیلیں گے،کوئی مخلوق کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ینزِل عِیسی ابن مریم فیدق الصلِیب ویقتل الخِنزِیر ویضع الجِزیة، ویهلک الله عز وجل فِی زمانِهِ الدجال، وتقوم الکلِمة لِلهِ ربِ العالمِین (السنن الواردة فی الفتن ۶/۱۲۴۲،رقم ۶۹۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتر کر صلیب کو توڑ دیں گے،خنزیر کو ماردیں گے،جزیہ ختم کردیں گے،اور اُن کے زمانہ میں اللہ تعالی دجال کو ہلاک کرے گا،اور اللہ تعالی کا کلمہ قائم ہوجائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت الفاظ کی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ،اور حضرت حسن رضی

اللہ عنہ کی روایت سے ملتی جلتی حدیث حدیث کی مشہور کئی کتابوں میں ہے۔

(ابوداؤد ح ۴۳۲۴، احمد ۹۲۷۰، ابن حبان ۶۸۲۱، مستدرک ح ۴۱۶۳)

غامدی صاحب کے نظریہ میں نہ حضرت عیسی علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں، نہ اتریں گے، نہ قتال کریں گے، نہ ایسے معرکے ہوں گے، عیسی علیہ السلام کی حیات اورنزول کی بحث گذر گئی ہے، ہمارے اسلاف واخلاف کے نزدیک یہ سب صحیح ہے، اور یہ غامدی کے نظریہ جہاد اورنظریہ اتمامِ حجت کے خلاف ہے۔

حضور ﷺ کی امت کی ایک جماعت ہمیشہ جہاد کرتی رہے گی، اور جہاد قیامت تک رہے گا:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لا تزال طائِفة مِن امتِي يقاتِلون على الحقِ ظاهرين الى يوم القيامة قال ،فينزِل عِيسى ابن مريم فيقول اميرهم تعال صلِ لنا، فيقول: لا ان بعضكم على بعض امير ليكرم الله هٰذه الامة (مسنداحمد ۱۴۷۲۰، المنتقى لابن الجارود ۱۰۳۱، السنن الواردة فى الفتن ۱۲۳۶/۶ ح ۶۸۶) ہمیشہ میری امت کی ایک جماعت حق کے لئے قتال کرتی رہے گی، اور غالب رہیں گے، قیامت کے دن تک ایسا ہوگا، تو حضرت عیسی علیہ السلام اتریں گے، تو اُن کو امیر کہے گا تشریف لائیں ہمیں نماز پڑھائیں، وہ فرمائیں گے نہیں، تم ایک دوسرے پر امیر ہو، تا کہ اللہ تعالی اس امت کو اعزاز دے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

لاتزال طائفة من امتي يقاتلون على الحق ،ظاهرين على من ناواهم حتى يقاتل آخرهم المسيح الدجال (ابوداؤد ۲۴۸۴) ہمیشہ میری امت کی ایک جماعت حق کے لئے قتال کرتے رہیں گے، وہ اہل حق اُن پر جواُن سے دشمنی کریں گے غالب رہیں گے، یہاں تک کہ اُن کے آخری آدمی مسیح دجال سے قتال کریں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول کریم ﷺ کا ارشاد نقل ہے:

الجهادماض منذبعثنى الله الى ان يقاتل آخرامتي الدجال،لايبطله جور جائزولاعدل عادل (سنن سعيدبن منصور ۱۴۳/۲ ،رقم ۲۳۶۷، ابوداؤد ۲۵۳۲، مسندابى يعلى ۴۳۱۱/۱، السنن الكبرى للبيهقى ۱۸۴۸۰ بسندجيد) جب سے اللہ تعالی نے مجھے مبعوث کیا ہے تب سے جہاد جاری ہوا اور یہاں تک

رہے گا کہ میری امت کے آخری لوگ دجال سے جہاد کریں گے، نہ ظالم حکمران کا ظلم نہ منصف کا انصاف اُس کو ختم کر سکے گا۔

حضرت حسن سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

الجهاد ماض منذ بعث الله نبيه الى آخر فئة من المسلمين تكون هى التى تقاتل الدجال (السنن الواردة فى الفتن ۳/۷۵۰، ح ۳۷۰) جہاد جاری رہے گا جب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث فرمایا ہے مسلمانوں کی اُس آخری جماعت تک جو دجال سے جہاد کرے گی۔

حضرت محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لاتبرح عصابة من امتى ظاهرين على الحق لايبالون من خالفهم حتى يخرج المسيح الدجال فيقاتلونه (سنن سعيد ۲/۱۴۵، رقم ۲۳۷۶) ہمیشہ میری امت کی ایک جماعت حق کے مددگار رہیں گے، جو اُن کی مخالفت کرے گا اُس کی پروا نہیں کریں گے، یہاں تک کہ مسیح دجال نکلے گا تو اُس سے جہاد کریں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

والجهاد ماض منذ بعث الله رسولهٗ الى آخر عصابة من المسلمين يقاتلون الدجال (مجموع فيه ثلاثة اجزاء حديثية، فوائد ابى على حامد بن محمد بن عبدالله الهروى، رقم ٦) جب سے اللہ نے اپنا رسول مبعوث فرمایا تب سے جہاد جاری ہے مسلمانوں کی اُس آخری جماعت تک جو دجال سے لڑیں گے۔

حضرت علی اور جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الجهاد ماض الى يوم القيامة منذ بعث الله محمداً الى آخر عصابة من المسلمين (كنز العمال رقم ۱۳۷۰، المعجم الاوسط ۴۷۷۵، حلية الاولياء ۳/۷۳، بسند ضعيف ولا حرج فانه شاهد) جہاد قیامت تک جاری رہے گا جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو بھیجا ہے مسلمانوں کی آخری جماعت تک (جو دجال سے لڑے گی)

امام بخاری رحمہ اللہ اور کئی محدثین نے ایک اور حدیث سے جہاد قیامت تک جاری رہنے پر دلیل لی ہے۔

حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الخيل معقود فى نواصيها الخير الى يوم القيامة الاجر والمغنم (بخارى ۲۸۵۲) گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت کے دن تک خیر باندھ دی گئی ہے یعنی اجر اور غنیمت۔

یہ حدیث متواتر احادیث میں سے ہے، اِس حدیث کے راوی حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، جابر بن عبداللہ، جریر بن عبداللہ، ابو ذر غفاری، مغیرہ بن شعبہ، انس بن مالک، سوادہ بن الربیع، عبداللہ بن مسعود، براء بن عازب، نعمان بن بشیر، سلمہ بن نفیل الکندی، علی بن ابی طالب، سہل بن الحنظلیہ ، اسماء بنت یزید، ابو کبشہ، عریب، وغیرہم رضی اللہ عنہم ہیں۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ گھوڑے قیامت تک جہاد میں استعمال ہوں گے، اور اُن کے ذریعے اجر اور غنیمت حاصل ہوتا رہے گا، ظاہر ہے کہ یہ سب تب ہی ہوگا کہ جہاد بھی رہے، جس سے صاف واضح ہوا کہ جہادی گھوڑے بھی رہیں گے، اور جہاد بھی رہے گا، اور گھوڑے جہاد میں قیامت تک استعمال بھی ہوتے رہیں گے، اور مجاہدین کو مالِ غنیمت بھی حاصل ہوتا رہے گا ان شاء اللہ، ہاں غامدی گروہ کو اُن کی سواری اور یہ اجر و غنیمت حاصل ہونے کا شاید موقع نہ ملے، کیوں کہ غنیمت کفار کے ساتھ جہاد میں حاصل ہوتی ہے، اور یہ صاحبان کفار سے جہاد کے قائل نہیں ہیں، اور دجال اور اُس کے گروہ سے جہاد کی کم از کم ذہنی تیاری کا بھی اِن کے ہاں ذکر نہیں ہے۔

اِن احادیث سے غامدی صاحب کے دونوں دعووں کا رد ہوتا ہے، ایک یہ کہ جہاد کی صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ظلم وعدوان کے خلاف جہاد ہو، یعنی کافروں سے جہاد ختم ہو گیا ہے، جیسا کہ مرزا قادیانی بھی یہی کہتا تھا، دوسرا یہ کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کسی پر نہ اتمامِ حجت ہو سکتا ہے، اور نہ کسی سے لڑنے اور قتل کرنے کی اجازت ہے۔

جو شخص کفر کا ارتکاب کرے، اُس کو کافر کہنے/سمجھنے کا حکم

غامدی صاحب لکھتے ہیں:

”ساتویں حد یہ ہے کہ کسی فرد کی تکفیر کا حق بھی کسی داعی کو حاصل نہیں ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ دین سے جہالت کی بناء پر مسلمانوں میں سے کوئی شخص کفر و شرک کا مرتکب ہو، لیکن اگر وہ اس کو کفر و شرک سمجھ کر خود اس کا اقرار نہیں کرتا، تو اس کفر و شرک کی حقیقت تو بیشک اس پر واضح کی جائے گی، اسے قرآن وسنت کے دلائل کے ساتھ ثابت بھی کیا جائے گا، اہلِ حق اس کی شناعت سے اُسے آگاہ بھی کریں گے، اور اس کے دنیوی اور اُخروی نتائج سے اسے خبردار بھی کیا جائے گا، لیکن اس کی تکفیر کے لیے چوں کہ اتمامِ حجت ضروری ہے، اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ حق اَب قیامت تک کسی فرد یا جماعت کو بھی حاصل نہیں رہا کہ وہ کسی شخص کو کافر قرار دے، مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی بھی سورہ توبہ ۹ کی آیت ۵ اور ۱۱ کے تحت زیادہ سے زیادہ کسی شخص یا گروہ کو غیر مسلم قرار دے سکتا ہے، اُسے کافر قرار دینے کا حق اسے حاصل نہیں

ہے۔" [برہان: ۳۱۹]

جواب:

غامدی صاحب کا نظریہ اتمامِ حجت بھی محض دعوی ہے اور بس، اُس پر دلیل کوئی نہیں، اور اِس تکفیرِ مرتد و کافر کے متعلق یہ نظریہ بھی محض دعوی ہے، دلیل وہی بلا دلیل دعوی ہے کہ اتمامِ حجت ضروری ہے، اور جب وہ دعوی بھی درست نہیں ہے، تو یہ دعوی کیسے درست ہوسکتا ہے؟

سورہ توبہ کی آیت ۵/اور ۱۱/ کا جو حوالہ دیا ہے، اُس میں تکفیر سے متعلق کوئی ایسی بات نہیں ہے، توجہ فرمائیں کہ اُن آیتوں میں ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ ،فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ. پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیتے رہیں تو اُن کا راستہ چھوڑ دو، اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دین میں بھائی ہے۔

اِن دونوں آیتوں سے پہلے عرب کے مشرکین کا ذکر ہے، اور اُن کے متعلق حکم ہوا کہ اُنہیں اشہرِ حُرم تک زندہ رہنے کی اجازت ہے، اور تم مسلمان اُن سے اِس مدت تک کوئی جہادی معرکہ نہ لڑو، لیکن اشہُر حرم ختم ہونے تک اگر ایمان نہ لائیں تو جہاں کہیں تمہیں ملیں اُن کو قتل کرو۔

اس کے بعد یہی اوپر مذکور آیت کا حصہ ہے، جس میں دوسری شق ذکر ہوئی کہ اگر ایمان لے آئیں کفر و شرک سے توبہ کرلیں اور مسلمانوں والے اعمال نماز، زکوۃ وغیرہ ادا کرنے لگیں، تو اب "**خلوا سبیلھم**" اُن سے جہاد نہ کرو، "**اخوانکم فی الدین**" وہ تمہارے مسلمان بھائی ہیں۔

قرآن کے متعلق سنّت کی مرضی نہیں چلتی کہ عام کو خاص اور خاص کو عام کرے، مگر غامدی گروہ کی مرضی چلتی ہے کہ یہ چاہیں تو عرب کے مشرکین کی آیت عام بنالیں، اور چاہیں تو عام آیت وحدیث عرب کے مشرکین کے ساتھ خاص کردیں، یہاں غامدی صاحب کے پاس: سوائے اپنا من پسند مطلب کشید کرنے کے کیا دلیل ہے جس کی بنیاد پر یہ آیت قیامت تک کے لوگوں کے لیے عام قرار پائی؟

پھر یہ آیت تو جہاد سے متعلق ہے کہ عرب کے مشرکین سے کب جہاد نہیں کرنا اور کب جہاد کرنا ہے؟ اِس کا کافر بننے والے، کفر کا ارتکاب کرنے والے شخص یا گروہ سے کیا تعلق ہے؟

اگر بالفرض مان لیں کہ آیت سے اشارۃً یہ مسئلہ نکلتا ہے، وہ اس طرح کہ اللہ تعالی نے فرمایا کہ اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کرلیں اور نماز زکوۃ ادا کرنے لگیں تو وہ تمہارے مسلمان بھائی ہیں، یعنی اُن کو کافر نہ سمجھو، تو اتنی بات میں تو کسی مسلمان کو کلام نہیں ہے، لیکن یہی کفر و شرک سے توبہ کرنے والے خدانخواستہ پھر کفر کا ارتکاب کرلیں مرتد ہوجائیں، کفریہ کلمہ بول لیں، یا کفریہ عمل کرلیں، تو پھر اُن کو یہ نہ کہا جائے کہ تم دوبارہ کفر کا

ارتکاب کر کے کافر ہو گئے ہو، یہ مسئلہ تو آیت کے کسی لفظ سے نہ صراحۃً نکلتا ہے نہ اشارۃً، نہ اقتضاء نہ دلالۃً، پھر اِس کے لکھنے سے کیا فائدہ؟ اور اِس سے استدلال کیسے؟ بس جی ۔ میرا کہا ہے قرآن کا فرمایا ہوا۔

پھر یہ بھی خوب توجہ سے سمجھیں کہ تکفیر کا معنی کسی مسلمان کو کافر بنانا نہیں ہوتا، بلکہ کافر بتانا ہوتا ہے، یعنی کلمہ کفر بول کر یا عقیدہ کفریہ اختیار کر کے یا ضروریاتِ دین میں سے کسی ضروری جزو ایمان بات کا انکار کر کے آدمی کافر خود بنتا ہے، اُس کو مولوی کا فتوی کافر نہیں بناتا، مولوی تو اپنے فتوے کے ذریعے محض یہ اظہار کرتا ہے کہ فلاں شخص یا فرقہ فلاں بول یا فعل یا کفریہ عقیدہ کے سبب کافر ہو گیا ہے، یعنی مولوی کی طرف سے محض حقیقتِ حال کا اظہار ہوتا ہے، تو اگر کوئی شخص خود کافر ہو جائے، لیکن اُس کو علم نہ ہو کہ میں کافر ہو گیا ہوں تو مولوی کا کام ہے کہ جب اس کے سامنے بات آئے تو وہ بتا سکتا ہے کہ فلاں شخص یا فرقہ اس سبب سے کافر بن گیا ہے، خصوصاً جب بہت سے آدمیوں کا ایک گروہ یا فرقہ کفر کا ارتکاب کرے، تو کفر کا ارتکاب کرنے کے بعد بہت سے احکام لاگو ہوتے ہیں: یعنی اُس سے مسلمان کا نکاح حرام ہو جاتا ہے، اور وہ کسی مسلمان میت کا وارث نہیں بنتا، مرے تو اُس کا جنازہ نہیں پڑھنا، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے، وغیرہ، اگر ایسوں کا کافر ہونا نہ بتایا جائے گا تو دوسرے لوگ اِن احکام پر کیسے عمل کریں گے؟ اور خود وہ لوگ اپنا کافر ہونا کیسے سمجھیں گے؟ پھر اگر ایسے عقائد کفریہ، اعمال کفریہ، اقوال کفریہ پر اُن کے کافر ہونے کا اظہار نہ کیا جائے گا، تو عوام ایسے اقوال وافعال وعقائد کو کفریہ اور گندے عقائد واقوال وافعال نہیں سمجھے گی، تو اِس فساد عظیم کا کیا بنے گا؟

ہاں! یہ اپنی جگہ مسلّم ہے کہ کافر بننے والے کو سمجھایا جائے گا، آپ لوگوں کو بھی تو معلوم ہے کہ بہت سے ائمہ اس بات کے قائل ہیں کہ جو مرتد ہو جائے، اُس کو تین دن جیل میں بند رکھا جائے گا، اور اُس کے جو شکوک وشبہات ہیں اُن کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی، اتمامِ حجت تو اُس کے مسلمان ہونے، اسلام قبول کرنے سے ہو گیا تھا، اب مرتد ہونے کے بعد کونسے اتمامِ حجت کی ضرورت ہے؟ سوائے اس کے کہ جن شبہات کے سبب وہ مرتد ہوا وہ شبہات دور کیے جائیں، اور وہ تین دن تک دور ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہی اِس کفریہ بات یا فعل یا عقیدہ اختیار کرنے والے کو سمجھایا جائے گا، مگر اُس کے کفر کے ارتکاب پر اُس کو کافر سمجھا بھی جائے گا اور کافر کہا بھی جائے گا۔

اگر آدمی کفر کا ارتکاب بھی کرے اور اُس کو کافر نہ کہا جائے تو پھر چوری کرنے پر آدمی کو چور، ظلم کرنے پر ظالم، زنا کرنے پر زانی وغیرہ بھی نہ کہا جائے، پہلے اُن پر اتمامِ حجت کی جائے کہ جی آپ نے جو کام کیا اُس کو چوری، ظلم، زنا کہتے ہیں، یہ برا فعل ہے، ایسے ہی جو منکرات سب انسانوں کی نظروں میں منکرات ہیں، اُن کا ارتکاب کرنے والوں کو پہلے اُن کا منکرات ہونا سمجھایا جائے، پھر اگر وہ منکرات سمجھ لیں

اس کے بعد مرتکب ہوں، تب ہی اُن کو منکرات کا مرتکب، چور ڈاکو، زانی، ظالم کہا جائے۔

یہ وہ چور دروازہ ہے جس سے قادیانی مسلمان کہے جائیں گے، اُن کو کافر و مرتد کہنا درست نہ ٹھہرے گا، منکرینِ حدیث بھی مسلمان کہلائیں گے، کفر بکنے والے رافضیوں وغیرہ کو بھی مسلمان کہا جائے گا، اور یہی وہ چور دروازہ ہے جس سے قطعیات وضروریاتِ دین کا انکار کر کے بھی غامدی صاحب اپنے کو مسلمان کہلوائیں گے۔

اس بارے میں نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث پیش نظر ہو!

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ثلث من اصل الایمان: الکف عمن قال لااله الاالله لاتکفره بذنب ،ولاتخرجه من الاسلام بعمل الحدیث (سنن سعیدبن منصور :۲۳۶۷،ابوداؤد:۲۵۳۲،مسندابی یعلی :۴۳۱۱،السنن الکبری للبیهقی :۱۸۴۸۰) تین باتیں ایمان کی اصل میں سے ہیں: جس نے **لااله الاالله** پڑھا (یعنی مسلمان ہوگیا) اُس سے رُک جانا، کہ کسی گناہ کے ارتکاب پر اُس کو کافر نہ قرار دو، اور کسی عمل کے سبب اُس کو اسلام سے خارج نہ کرو۔

ملاعلی قاری رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں:

الکف عمن قال لااله الاالله ای الامتناع عن التعرض باهل الاسلام لاتکفره بالتاء نهی وبالنون نفی وکلاهما مروی وهوبیان للکفر،ولذاقطعه عنه، والاکفاروالتکفیرنسبة احدالی الکفر،بذنب ای سوی الکفرولوکبیرة خلافاللخوارج، ولاتخرجه بالوجهین من الاسلام بعمل ولوکبیرة سوی الکفرخلافاللمعتزلة فی اخراج صاحب الکبیرة الی منزلة بین المنزلتین (مرقات ۱/ ۱۳۱) یعنی جو **لااله الاالله** کہہ کر اہل اسلام میں سے ہوگئے اُن سے چھیڑ چھاڑ سے رکنا ہے، اکفار اور تکفیر کسی کو کفر کی طرف منسوب کرنا ہے، یعنی سوائے کفر کرنے کے کسی گناہ کے ارتکاب پر چاہے وہ کبیرہ گناہ ہو کافر نہ کہو، خوارج اس کے خلاف ہیں، اور کفر کے سوا کسی عمل کے سبب چاہے کبیرہ گناہ ہو آدمی کو اسلام سے خارج نہ کرو، معتزلہ اس کے خلاف ہیں، وہ کبیرہ کے مرتکب کو اسلام سے خارج کرتے ہیں، دو منزلوں کے درمیان کی منزل میں ٹھہرا کر۔

مطلب صاف ہے کہ کسی گناہ پر کسی مسلمان کو کافر کہنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر خدانخواستہ مسلمان کفر کرلے تو پھر اُس پر کافر ہونے کا حکم لگانا مجبوری اور ظاہر پر حکم لگانا ہے، اور ہم ظاہر کے مکلّف ہیں، جب کوئی اسلامی احکام کے ماننے کا اقرار کرے گا اُس کو مسلمان کہیں گے، اور اسلامی احکام میں سے کسی کا یا سب کا انکار کرے گا کافر کہیں گے کیوں کہ وہ خود کافر ہوگیا ہوگا۔ (جاری ہے۔۔۔)

صاحبزادۂ امام اہل سنت مولانا عبدالحق خان بشیر

شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کا

مصالحتی اجلاس......اور......منکرین حیاتِ انبیاء کا طرزِ عمل

مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہان پوریؒ کے فتویٰ (جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶) اور دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مفتی حضرت مولانا مفتی محمد اکمل صاحب کے فتویٰ (۳۰/ ذیقعدہ ۱۳۷۷ھ) کے بعد بھی جب منکرین حیات الانبیاء کے طرزِ عمل اور غلو میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوسکی تو شیخ التفسیر حضرت مولانا امام احمد علی لاہوریؒ نے ضیغم اسلام حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے ذریعہ مورخہ ۱۸، ۱۹/ جون ۱۹۶۰ء کو فریقین کے چیدہ چیدہ علماء کا ایک خصوصی اجلاس جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ لاہور میں طلب کرلیا، تاکہ اِس خالص علمی اِختلاف کا علمی اَنداز سے ہی حل تلاش کیا جائے۔ اگر کوئی فریق کسی آیتِ قرآنی کی تفسیر وتعبیر یا کسی حدیثِ رسول کی تفہیم وتشریح کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہے تو اہل السنۃ والجماعۃ کی اجماعی اور علمائے اہل سنت دیوبند کی اتفاقی تحقیقات وتعلیمات کی روشنی میں اس کی حقیقی تعبیر وتشریح تک رسائی حاصل کی جاسکے۔

افہام وتفہیم کے اِس مقصد وضرورت کے تحت حضرت امام لاہوریؒ کی طرف سے اِس خصوصی اِجلاس میں شرکت کے لیے فریقین کے چند مخصوص علماء کو دعوت دی گئی۔ البتہ اِس دعوت میں یہ اجازت و رعایت بھی شامل تھی کہ اگر کوئی فریق چند مزید علماء کو علمی معاونت کے لیے ساتھ لانا چاہے تو لاسکے گا۔ گویا یہ صرف علماء کرام کا ایک خصوصی اجلاس تھا۔ جس کا مقصد مناظرہ ومجادلہ نہیں بلکہ صرف باہمی مباحثہ و مذاکرہ تھا۔ تاکہ علماء آپس میں بیٹھ کر عالمانہ وقار کے ساتھ علمی مذاکرہ کے ذریعہ علمی مسائل کو علمی انداز سے حل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن بدقسمتی سے منکرین حیات انبیاء نے اسے انانیت کا مسئلہ بنالیا۔ اور اِس خالص علمی مذاکرہ کو مناظرہ ومجادلہ کا رنگ دینے کے لیے گجرات، سرگودہا، میانوالی، راولپنڈی اور گوجرانوالہ وغیرہ علاقوں سے اپنے سیکڑوں عقیدت مندوں کی بیسیوں بسیں بھر کر شیرانوالہ گیٹ لاہور جا پہنچے۔ ہر باہوش وذی شعور شخص اس کے پس منظر میں ان کی بے بسی کا تماشا ونظارہ بآسانی کرسکتا ہے۔ حضرت لاہوریؒ اور اُن کے رفقاء کو منکرین حیات انبیاء کا یہ بازاری وپیشہ وارانہ طرزِ عمل سخت ناگوار گزرا۔ اور اُن کی طبیعتیں اس سے بہت نالاں ہوئیں۔ لیکن اپنے روایتی درگزر سے کام لیتے ہوئے حضرت لاہوریؒ نے اپنے دفتر خدام الدین سے ان حضرات کو پیغام بھیجا کہ: آپ نے عام لوگوں کا ہڑبونگ جمع کرکے ہمارے اصل مقصد پر شب خون

مارنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال اَب وہ آچکے ہیں تو ہمارے مہمان ہیں۔ ہم اُن کے لیے طعام و چائے وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ آپ اُنھیں مسجد میں بٹھا کر اَز راہِ کرم میرے دفتر میں تشریف لے آئیں، تاکہ وہاں علماء کے درمیان پیار و وَقار کے ساتھ گفتگو ہو سکے۔ مگر منکرین حیات نے حضرت لاہوریؒ کی یہ ہمدردانہ ومخلصانہ پیش کش انتہائی بے دردی کے ساتھ مسترد کر دی اور مسجد میں اپنے حواریوں کے سامنے اعلان کر دیا کہ: ہم یہاں مناظرہ کے لیے ہی آئے ہیں، اَب مناظرہ ہی ہوگا۔ جو مسجد کے اندر اور پبلک کے سامنے ہوگا۔ منکرین حیات کا یہ جواب اور طرزِ عمل کہاں تک درست تھا؟ ہر ہوش مند آدمی اسے اچھی طرح معلوم ومحسوس کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ اِس ہٹ دھرمانہ جواب نے حضرت لاہوریؒ جیسے مضبوط اعصاب کے مالک فولادی اِنسان کو بھی رُلا دیا۔

حضرت لاہوریؒ مناظرہ کرسکتے تھے یا نہیں؟ فی الوقت ہمیں اِس سے بحث نہیں۔ لیکن اُن کے طرزِ زندگی اور اندازِ جدوجہد سے واقفیت رکھنے والے حضرات اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ وہ مناظرانہ مزاج نہیں رکھتے تھے۔ وہ فکری وحدت کے علمبردار تھے۔ پاکستان کو خالص اسلامی ریاست بنانا اور اس میں اسلامی نظام کا نفاذ کرنا ان کی جدوجہد کا بنیادی محور ومرکز تھا۔ اور منکرین حیات اُن کے اِس مزاج سے پوری طرح واقف تھے۔

اِس شرمناک واقعہ کا یہ پہلو انتہائی قابل غور ہے کہ: حضرت لاہوریؒ کے اپنے مرکز جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ میں اس وقت صرف منکرین حیات موجود تھے، حضرت لاہوریؒ کا اپنا حلقہ وہاں موجود نہیں تھا، اگر حضرت لاہوریؒ منکرین حیات کی اِس ہٹ دھرمی کی بناپر اپنے حلقہ کو مسجد میں بلا کر اسے مسجد خالی کرانے کا حکم دیدیتے تو حالات کی صورت کیا ہوتی؟ اور اِس خون خرابے کا ذمہ دار کون ہوتا؟ حضرت لاہوریؒ کی فراست وبصیرت یہ بھانپ چکی تھی کہ منکرین حیات کسی مخفی و پوشیدہ قوت کے آلہ کار بن چکے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اس اسلام دشمن قوت کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں۔ وہ قوت لاہور کے اَندر ایک مذہبی تصادم قائم کرکے اپنے کچھ مکروہ عزائم پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہے۔ حضرت لاہوریؒ نے پیغام بھیج کر اپنے کچھ جوشیلے قسم کے مریدین کو بھی مسجد میں آنے سے روک دیا۔ اور خود بھی دفتر میں بند ہوگئے۔ ان حالات میں حضرت لاہوریؒ جیسے صاحب دِل انسان کے دِل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ اس کا اندازہ کوئی صاحبِ دِل ہی کرسکتا ہے۔ غالبًا اسی موقع پر حضرت لاہوریؒ نے فرمایا تھا: اِن نادانوں کے دِلوں میں نہ عقیدت ہے اور نہ بصیرت۔ اگر ان کے دلوں میں عقیدت ہوتی تو یہ اپنے بزرگوں کی تحقیقات کو تسلیم کرلیتے، اس سے انحراف و روگردانی نہ کرتے۔ اور اگر ان کے دِلوں میں بصیرت ہوتی کشف وروحانیت کی آنکھوں سے خود روضۂ اقدس کے اندر آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ کا مشاہدہ کرلیتے۔ یہ لوگ عقیدت وبصیرت کی دونوں نعمتوں سے محروم

ہیں۔ حضرت لاہوریؒ کا یہ ایمان افروز اور روح پرور بیان اَب تک بہت سی حقیقتیں بے نقاب کر چکا ہے۔ ہزاروں سینوں کی جہالتیں دُور اور ہزاروں دلوں کی ظلمتیں کافور کر چکا ہے۔ لیکن کچھ لوگ آج بھی بدقسمتی سے اپنی پرانی روش پر قائم ہیں۔ شاید آج بھی وہ ان دونوں نعمتوں (عقیدت و بصیرت) سے محروم ہیں۔

حضرت لاہوری رحمہ اللہ کا عقیدہ حیات النبی:

شیخ التفسیر امام لاہوریؒ کی تمام مخلصانہ کاوشیں منکرینِ حیات کی ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھ چکیں تو حضرت لاہوریؒ کے حلقہ نے عقیدہ حیات النبی کے بارہ میں اپنے شیخ و مرشد کا موقف و نظریہ معلوم کرنے کی کوشش کی، جس کے جواب میں حضرت لاہوریؒ نے اپنا عقیدہ ”ہفت روزہ خدام الدین، لاہور“ میں بایں الفاظ شائع فرمایا:

”میرا عقیدہ وہی ہے جو اکابر [اہل سنت] دیوبند حضرات کا ہے کہ: انبیاء اپنی اپنی قبروں میں اُسی جسد عنصری سے زندہ ہیں جو اِس دنیا میں تھا، وہ حیات باعتبار ابدانِ دنیوی 'دنیوی' بھی ہے اور باعتبار عالم برزخ 'برزخی' بھی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا ابدانِ دنیوی کے ساتھ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہونا اہل السنۃ والجماعۃ کا متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے۔ ہمارے اکابر [اہل سنت] دیوبند نے اِس پر مفصل اور مدلل اِرشادات ثبت فرمائے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ مسئلہ اکابر [اہل سنت] دیوبند میں کبھی مختلف فیہ نہیں رہا، میرے خیال میں کوئی صاحبِ بصیرت اس عقیدہ حیات النبی کا منکر نہیں ہوسکتا۔ جن کی باطن کی آنکھیں کھلی ہیں اُن کے نزدیک تو حضور ﷺ کی روضۂ اطہر کی حیات بدیہات میں سے ہے۔“ [ہفت روزہ خدام الدین، ۹ ر دسمبر ۱۹۶۰ء، ص: ۳]

گویا کہ حضرت امام لاہوریؒ نے بھی اپنے عقیدہ کی کھلی وضاحت فرمادی اور اس وضاحت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے عقیدہ کی وضاحت قرآن و حدیث کے حوالہ سے نہیں بلکہ بزرگانِ دیوبند کے حوالہ سے کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لاہوریؒ کو اپنے اسلاف اور بزرگوں کی تحقیق پر کلی اعتماد تھا اور وہ اس تحقیق کو قرآن و سنت سے باہر نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا وہ لوگ جو قرآن و حدیث کو اسلافِ دیوبند کی تحقیق کے بغیر سمجھنا چاہتے ہیں، اپنے طرزِ عمل پر غور کریں۔

شاگرد کی دوسرے استاد سے بھی بغاوت:

ہم گزشتہ قسط میں بیان کر چکے ہیں کہ: مولانا سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری کے سوانح نگاروں نے مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہان پوریؒ کا تذکرہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری کے اساتذہ میں کیا ہے۔ اور استاد مولانا مفتی سید مہدی حسنؒ اپنے شاگرد (سید عنایت اللہ شاہ بخاری) کو عقیدہ حیات النبی سے انکار کی بنا پر اپنے فتوے میں: ”بدعتی، خراب عقیدے والا اور اہل السنۃ

والجماعۃ سے خارج'' قرار دے چکا ہے۔ اور شاگرد نے زندگی کے آخری سانس تک پوری جرأت اور استقامت کے ساتھ اپنے استاد کا رَد بھی کیا ہے اور مقابلہ بھی۔

قارئین کرام کے لیے شاید یہ بات بھی انکشافِ جدید کا درجہ رکھتی ہو کہ شاہ صاحب کے سوانح نگاروں کے نزدیک شیخ التفسیر حضرت لاہوریؒ کا شمار بھی شاہ صاحب کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ علامہ عنایت اللہ گجراتی رقم طراز ہیں کہ: ''اِسی طرح (سید عنایت اللہ شاہ صاحب نے) حضرت مولانا احمد علی صاحب مرحوم و مغفور سے ملتان جیل میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے طرز پر قرآن پاک پڑھا اور اس خصوصی طرز کے امین قرار پائے۔'' [سید عنایت اللہ شاہ بخاری: ۲۴] اِسی صفحہ پر علامہ عنایت اللہ گجراتی نے شاہ صاحب کے بارہ اساتذہ کی جو فہرست جاری کی ہے، اس میں دسویں نمبر پر حضرت لاہوری کا نام موجود ہے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین نیلوی نے اپنی کتاب ''ناشر القرآن'' کے صفحہ ۱۲۵ر پر اور ''جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ'' سرگودھا کی مطبوعہ کتاب ''مولانا حسین علی: شخصیت، کردار، تعلیمات'' کے صفحہ نمبر ۲۹۸ر پر شاہ صاحب کے اساتذہ میں حضرت لاہوریؒ کا تذکرہ موجود ہے۔

قارئین کرام! تلمذ کے اِس رشتہ کو بھی دیکھیں اور استاد کے خلاف شاگرد کے رویہ کا بھی جائزہ لیں! شاید کسی نتیجہ پر پہنچنے اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ بہر حال استاد سے اختلاف ممکن ہے، لیکن اس کے خلاف پیشہ ورانہ محاذ آرائی اور اس کو نیچا دِکھانے کی کوشش نا قابل فہم ہے، جبکہ اس کے اہل حق اور اسلافِ دیوبند کا ترجمان ہونے میں بھی کوئی شبہ نہ ہو۔

مریدین کا توہین آمیز رویہ:

اگر یہ بات شاہ صاحب تک ہی محدود رہتی تو شاید اس کے کوئی دور رَس منفی اثرات مرتب نہ ہوتے، لیکن بد قسمتی سے شاہ صاحب کے مریدین نے بھی حضرت لاہوریؒ کے خلاف توہین آمیز طرز اختیار کر لیا۔ اُن کی یہ جسارت پیر و مرشد کے فیض کا ثمرہ تھی یا اجتہاد کا نتیجہ؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کے بیشتر مریدین میں توہینِ حضرت لاہوریؒ کے جراثیم سرایت کر چکے تھے۔ اور اُن میں صرف جاہل عوام شامل نہ تھے، بلکہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو منکرین حیات کے جماعتی اسٹیج پر خطاب و نقابت کا اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک خطیب سے کافی عرصہ قبل ایک مقام پر شرائطِ مناظرہ طے کرنے کے دوران جب ماضی کی مصالحتی کوششوں کا ذکر ہوا تو اُس نے بڑے مشتعل اور توہین آمیز انداز سے مجھے جواب دیا کہ: یاد ہے کہ وہ تھپڑ جو محمد علی جالندھری کے منہ پر پڑا۔ اور یاد ہے جب احمد علی لاہوری ہمیں بلا کر خود اپنی مسجد چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ میں اُس شخص کی جسارت پر حیران تھا کہ وہ کس قدر جرأت و ڈھٹائی کے ساتھ توہین اسلاف کا مرتکب ہو رہا ہے۔ میں نے اس پر اتنا ہی جواب دیا کہ: وہ شخص جس نے ساری زندگی آنحضرت ﷺ کی ختم

نبوت کا تحفظ کیا، اُس کے چہرے پر شاید تھپڑ مارنے کا نتیجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تھپڑ مارنے والے پر توبہ و ہدایت کے دروازے بند کردیئے ہیں۔ اُسے تادم آخر توبہ کی توفیق نہ ملے گی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرا یہ کہنا کہاں تک درست تھا، البتہ یہ حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کی اپنے اس موقف سے واپسی نہیں ہوئی جو اُنہوں نے اسلاف دیوبند کی اجماعی تحقیق کے خلاف اختیار کیا تھا۔ بہرحال شاہ صاحب کے مریدین کی یہ جسارتیں دنیوی سعادت اور اُخروی نجات سے اُن کی محرومی کا باعث بن سکتی ہیں۔ خدا اُنھیں سمجھنے کی توفیق بخشے۔ آمین یارب العالمین

حضرت لاہوریؒ کی مصالحتی کوششوں سے یہ سلوک منکرین حیات کی فکری پسپائی کا منظر پیش کرتا ہے یا نہیں؟ اس پر خود قارئین غور کرلیں۔

(اقتباس از مضمون: جامعہ خیر المدارس ملتان کے اجتماع سے...... جامعہ صدیقیہ گوجرانوالہ کے اجتماع تک منکرین حیات انبیاء کی مرحلہ وار فکری شکست (قسط ۵) شائع شدہ: مجلّہ نورِ بصیرت، بہاول پور (سلسلہ اشاعت:۲۰) ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ مئی، جون ۲۰۰۷ء) ☆☆☆☆

غیر مقلدیت کے محاذ پر مولانا اوکاڑویؒ کی خدمت: کتب غیر مقلدین کی اشاعت

اِس محاذ پر مولانا مرحوم نے چھٹی خدمت یہ سرانجام دی کہ غیر مقلدین کی اَصل کتب (جنھیں وہ عوام کی پہنچ سے دُور رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔) کے عکس شائع کرادیئے، اُن میں سے چند کتب کے نام درج ذیل ہیں: [۱]۔مآثر صدیقی: جو سید علی حسن خان نے اپنے والد نواب صدیق حسن خان کی سوانح لکھی ہے۔ جس میں برطانوی گورنمنٹ کے ساتھ نواب صاحب کی وفاداری اور صلہ میں ملنے والے انعامات کا تذکرہ ہے۔ [۲]۔ترجمانِ وہابیہ: جس میں نواب صدیق حسن خان نے یہ ثابت کیا کہ انگریز کے خلاف لڑائی حرام ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی حنفیوں نے لڑی۔ غیر مقلدین نے کبھی بھی جہاد نہیں کیا، بلکہ وہ حجرہ نشین قسم کے لوگ ہیں۔ [۳]۔عرف الجادی من جنان الهادی: یہ نواب صاحب کے بیٹے نواب نورالحسن خان کی تالیف ہے۔ اِس کے مسائل: غیر مقلدین کے عمل بالحدیث کو کافی حد تک بے نقاب کردیتے ہیں۔ [۴]۔الاقتصاد فی مسائل الاجتهاد: جس میں مولانا محمد حسین بٹالوی نے انگریزی گورنمنٹ کو سایۂ رحمت قرار دیتے ہوئے اُس کے خلاف جہاد کو حرام قرار دیا۔ اور بقول مولانا مسعود عالم ندویؒ اِس کتاب کے صلہ میں انعام میں جاگیر پائی۔ [۵]۔نزل الابرار من فقه النبی المختار [۶]۔کنز الحقائق من فقه خیر الخلائق [۷]۔هدیة المهدی من فقه المحمدی: یہ تینوں کتب نواب وحید الزمان خان کی ہیں۔

(ماہنامہ حق چاریار، مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی نمبر: ۱۳۴، مضمون: مولانا عبدالحق خان بشیر)

مولانا مفتی رب نواز حفظہ اللہ
مدیر اعلیٰ: مجلّہ الفتحیہ، احمد پور شرقیہ

مناظرہ حیات الانبیاء علیہم السلام کا تقابلی مطالعہ

حضرت مولانا امین صفدر اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے یادگار مناظروں میں ایک وہ مناظرہ ہے جو اُنہوں نے مماتیوں کے قائد علامہ احمد سعید خان چتروڑگڑھی سے کیا۔ اوکاڑوی صاحب کا دعویٰ تھا:

''انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں، قبر میں روح کا تعلق جسم کے ساتھ قائم ہے۔''

اس کے بالمقابل علامہ احمد سعید خان صاحب پہلے تو اپنا دعویٰ پیش کرنے سے انکاری رہے، لیکن دَوران مناظرہ انہوں نے کہا:

''کوئی نبی موت کے بعد اس دنیا والی قبر کے اندر حیات جسمانی کے ساتھ زندہ نہیں۔''

یہ مناظرہ ملک کے طول وعرض میں بہت مقبول ہوا، بلکہ اس کے کیسٹیں بیرون ممالک بھی پہنچیں، بندہ نے یہ مناظرہ کیسٹ کے ذریعہ سنا اور کتاب میں پڑھا، مناظرہ سننے اور پڑھنے کے بعد جو تاثرات ذہن میں نقش ہوئے ہیں انہیں کاغذ پر منتقل کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

اوکاڑوی دلائل کے امتیازات

☆......حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ کے دلائل دعویٰ پر صریح تھے یعنی ان کا دعویٰ دلائل سے صراحۃً ثابت ہوتا تھا۔ ان کے دلائل میں ایک دلیل ذیل کی حدیث نبوی ہے:

''اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِھِمْ یُصَلُّوْنَ، انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں، نماز پڑھتے ہیں۔''

اِس حدیث میں ''انبیاء'' کی تصریح ہے۔ ''قبر'' کا لفظ ہے۔ اور ''زندہ'' ہونے کی صراحت ہے۔ بلکہ اس میں انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ امتیازی کا پہلو بھی مذکور ہے کہ قبروں میں نماز پڑھا کرتے ہیں۔

اس کے بالمقابل خان صاحب کے مزعومہ دلائل صریح نہ تھے مثلاً:

''اللہ یتوفی الانفس حین موتھا......ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ من لایستجیب لہ الی یوم القیامۃ......لا تستجیبون لھم بشیٔ الا کباسط کفیہ الی الماء

لیبلغ“.

ان تینوں آیات میں نہ ”نبی“ کا لفظ ہے۔ نہ ”قبر“ کی بات ہے۔ نہ قبروں میں انبیاء علیہم السلام کے ”مردہ“ ہونے کا ذِکر ہے۔ اور نہ ہی خان صاحب اِن آیات کا مَن پسند مطلب کسی مفسر کی زبانی بیان کر سکے۔

☆......اوکاڑوی صاحب رحمہ اللہ کے دلائل دعویٰ کے مطابق تھے، مثلاً: انہوں نے مسلم شریف سے حدیث پیش کی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مَرَرْتُ عَلٰی مُوْسٰی لَیْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ عِنْدَ الْکَثِیْفِ الْاَحْمَرِ وَهُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ فِیْ قَبْرِہٖ**، میں معراج کی رات سرخ ٹیلے کے پاس موسیٰ کی قبر سے گزرا، وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ (مسلم: ۲/۲۶۸)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا نماز پڑھنا حیات کی دلیل ہے اور نماز پڑھنا چوں کہ قبر میں تھا اس لیے قبر کی حیات ثابت ہوئی۔

جب کہ خان صاحب کے دلائل دعویٰ کے مطابق نہ تھے مماتیوں کا دعویٰ قبروں میں ممات کا ہے، مگر خان صاحب دنیا والی موت پر حوالے پیش کرتے رہے، مثلاً: وحی منقطع ہو چکی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تریسٹھ سال ہے وغیرہ۔ حالاں کہ محلِ نزاع نہ دنیا کی موت ہے اور نہ ہی جنت کی زندگی۔ اختلاف تو قبر کی حیات یا ممات میں ہے۔

☆......حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے اپنے دعویٰ پر پہلی حدیث کا متواتر ہونا نقل کیا۔ مگر خان صاحب اپنی پیش کردہ روایات میں سے کسی روایت کا متواتر ہونا محدثین سے نقل نہیں کر سکے۔

☆......حضرت اوکاڑوی صاحب رحمہ اللہ نے ایک دلیل درج ذیل حدیث ذِکر کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب کوئی مسلمان مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو متوجہ فرماتے ہیں، میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

پھر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے اس حدیث کے راویوں کا ثقہ ہونا، علامہ مناوی، نووی، ابن کثیر، سخاوی، شبیر احمد عثمانی اور انور شاہ کشمیری بلکہ نواب صدیق حسن خان غیر مقلد کے حوالے سے بھی اس حدیث کا صحیح ہونا نقل کیا ہے۔

راقم الحروف/ رب نواز عفا اللہ عنہ کہتا ہے کہ نواب صاحب کے علاوہ بھی بہت سے آلِ

غیر مقلدیت اس حدیث کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں مثلاً حافظ زبیر علی زئی نے اسے ’’حسن‘‘ قرار دیا ہے۔
(تخریج ریاض الصالحین، حدیث:۱۴۰۲)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

’’محدثین کے نزدیک رَدِروح والی حدیث حسن درجے کی یعنی قابل قبول ہے۔‘‘

(شرح ریاض الصالحین:۲/ ۳۱۵)

حاصل یہ کہ اوکاڑوی صاحب نے حدیث ذِکر کر کے اس کا صحیح ہونا محدثین سے نقل کیا، لیکن خان صاحب اپنی پیش کردہ روایات میں سے کسی روایت کی صحت محدثین کے حوالوں سے ثابت نہ کر سکے، بلکہ بعض مقامات پر حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے سند کی صحت کا مطالبہ بھی کیا، مثلاً: ’’اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ، وحی منقطع ہو چکی‘‘... قیامت سے پہلے چھ چیزوں کا ہونا ضروری ہے، سب سے پہلے میرا دنیا سے چلا جانا وغیرہ مگر مطالبہ کے باوجود صحیح سند پیش کرنے سے عاجز رہے، بلکہ اکثر روایات کا مآخذ تک ذِکر نہیں کیا چہ جائیکہ ان کا صحیح ہونا محدثین سے ثابت کرتے۔

☆......حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے اپنے دعویٰ پر قرآن وحدیث پیش کرنے کے ساتھ ساتھ صاحب ’’نظم المتناثر‘‘، علامہ سیوطی اور امام بیہقی رحمہم اللہ وغیرہ حضرات محدثین کے حوالے بھی ذِکر کیے مگر خان صاحب ایسا نہیں کر سکے۔ شاید اس لیے کہ انہیں اپنا حامی مماتی محدث مل ہی نہیں سکا۔

اوکاڑوی گرفت اور چتروڑی بے بسیاں

☆......جناب علامہ احمد سعید خان صاحب کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ: ’’انبیاء کرام اپنی قبروں میں مردہ ہیں۔ اَرواح کا جسموں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بات ستر آیات اور اٹھارہ سو اَحادیث سے ثابت ہے۔‘‘ لیکن افسوس کہ وہ مناظرہ میں کوئی ایک صحیح دلیل پیش نہ کر سکے حتی کہ حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے دوران مناظرہ انہیں متعدد بار للکارا بھی ہے کہ آپ ستر (۷۰) آیات اور اٹھارہ سو (۱۸۰۰) احادیث رکھنے کے مدعی ہیں، وہ کہاں ہیں؟ لاؤ۔ اگر ستر نہیں صرف ایک آیت پیش کردو اور ایک حدیث ایسی پیش کریں جس کا یہ مضمون ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں مردہ، کھجور کے تنے اور کنکریوں کی طرح بے جان ہیں اور قبر میں پڑھا جانے والا درود وسلام نہیں سنتے، مگر برانگیختہ کرنے اور للکارنے کے باوجود ایک حدیث بھی پیش کرنے سے عاجز رہے۔

☆......خان صاحب نے اپنے مدعا پر ’’لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا ... روایت پیش کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر (سیدنا) موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے۔‘‘

حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے خان صاحب سے مطالبہ کیا کہ اس روایت کی صحت ثابت کرو، مگر وہ اسے صحیح ثابت کرنے سے قاصر رہے۔

تنبیہ: کسی زمانے میں آلِ غیر مقلدیت اس روایت کو تقلید کی تردید میں پیش کیا کرتے تھے مگر دَورِ حاضر کے غیر مقلدوں نے اسے ضعیف تسلیم کرلیا ہے۔ (مقالات الحدیث: ۱۰۵)

حافظ زبیر علی زئی غیر مقلد اِس روایت کے تحت لکھتے ہیں:

''اس روایت کی سند کا مدار مجالد بن سعید بن عمیر الھمد انی الکوفی پر ہے۔ مجالد کے بارے میں حافظ ہیثمی نے کہا: **وضعفہ الجمھور**، اور جمہور (محدثین) نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (مجمع الزوائد: ۴۱۶/۹) خلاصہ یہ کہ یہ روایت اپنے تمام شواہد کے ساتھ ضعیف ہی ہے۔''

(اضواء المصابیح: ۲۳۸/۱، حدیث: ۱۷۷)

☆......خان صاحب نے مؤطا مالک کے حوالے سے حدیث پیش کی: **ترکت فیکم الامرین: اوّلھما کتاب اللہ**، میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، ان دو میں پہلی اللہ کی کتاب ہے۔

اوکاڑوی صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: ''**اوّلھما**'' کے الفاظ مؤطا مالک میں نہیں ہیں۔ خان صاحب نے کہا: ''یہ الفاظ اس میں ہیں۔'' اوکاڑوی صاحب نے مطالبہ کیا: کتاب پیش کرو، لیکن نہ وہ کتاب پیش کر سکے اور نہ وہ لفظ مؤطا مالک سے ثابت کر سکے۔

اوکاڑوی دلائل اور چتروڑی دفاع

مناظرہ میں ہر فریق اپنے دلائل پیش کرتا ہے اور مخالف دلائل کا جواب دیتا ہے، علامہ احمد سعید خان صاحب اپنے دعویٰ پر کوئی صحیح اور صریح دلیل دینے سے تو یقیناً عاجز رہے ہیں، مگر افسوس کہ وہ مولانا امین اوکاڑوی صاحب رحمہ اللہ کے دلائل کا کوئی صحیح جواب بھی نہیں دے سکے، بلکہ متعدد دلائل کا تو سرے سے جواب ہی نہیں دیا۔

(۱) حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے ایک دلیل ''**الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون**، انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں، نماز پڑھا کرتے ہیں۔'' پیش کی ہے۔ خان صاحب نے اس کے جواب میں کہا: قبر میں نماز پڑھنا ''**واعبد ربک حتی یاتیک الیقین**، اپنے رب کی عبادت کرو یہاں تک موت آجائے۔'' کے خلاف ہے کیوں کہ اس آیت میں موت تک عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

مگر صحیح بات یہ ہے کہ آیت و حدیث میں کوئی تضاد نہیں، آیت میں تکلیفی عبادت کا ذِکر ہے جب کہ حدیث میں غیر تکلیفی عبادت کے طور پر نماز پڑھنے کا تذکرہ ہے۔ تفصیل آگے ''نرالی تحقیق یا چتروڑی

تحقیق'' عنوان کے تحت آ رہی ہے، اِن شاء اللہ۔

(۲) حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے مزید دلیل ذکر فرمائی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔ (مسلم شریف)

خان صاحب نے اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ کہہ کر ٹرخانے کی کوشش کی۔ حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں قبر میں نماز پڑھتے دیکھ لینا تو معجزہ ہے، مگر ان کا نماز پڑھنا معجزہ نہیں بلکہ حیاتِ قبر کی دلیل ہے جیسے مکہ میں بیٹھے بیت المقدس کو دیکھ لینا معجزہ نبوی ہے، لیکن زمین پر بیت المقدس کا وجود معجزہ نہیں، وہ تو آپ کی ولادت سے پہلے ہی زمین پر تھا۔ خان صاحب جواب الجواب سے عاجز ہو کر رہ گئے۔

(۳) اوکاڑوی صاحب کے دلائل میں ایک دلیل درج ذیل حدیث ہے:

اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے، پس اللہ کا نبی زندہ ہے، اسے رزق دیا جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

خان صاحب اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔

بطور نمونہ ہم نے تین دلیلیں ذکر کر دی ہیں۔ مزید دلائل اصل مناظرہ میں پڑھ لیں۔ اس کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ خان صاحب نے بعض دلائل کا صحیح جواب نہیں دیا اور بعض کا بالکل ہی جواب نہیں دے پائے، نہ صحیح اور نہ غیر صحیح۔ البتہ یہ کہہ کر رعب ڈالنے کی کوشش کی کہ جب میں بولوں گا تو یہ سب حدیثیں بھاگ جائیں گی.... مگر وہ مناظرہ کے آخر تک انہیں بھگا نہیں سکے اور نہ ہی حدیثوں کو بھگانا کسی کے بس میں ہے۔

علامہ احمد سعید خان صاحب کا دوہرا معیار

مناظرہ سننے اور پڑھنے سے ایک چیز یہ بھی معلوم ہوئی کہ علامہ احمد سعید خان صاحب ''دوہرے معیار'' کے حامی رہے ہیں، وقتاً فوقتاً ان کا معیارِ تحقیق بدلتا رہا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضرت اوکاڑوی رحمہ اللہ نے حدیث پیش کی:

جب کوئی مسلمان مجھ پر سلام پڑھتا ہے تو اللہ میری روح کو رَد (متوجہ) فرما دیتے ہیں میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ (مسند احمد)

خان صاحب نے اس کے جواب میں کہا:

’’ایمان سے بتلائیں کہ اس میں کوئی قبر کا لفظ آیا ہے؟‘‘ **انتھی**

عرض ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک چوں کہ قبر میں ہے تو رَدِ رُوح بھی قبر ہی میں ہوتا ہے۔ بہرحال خان صاحب کے نزدیک یہ حدیث دلیل بننے کی صلاحیت اس لیے نہیں رکھتی کہ اس میں صراحۃً قبر کا لفظ نہیں، مگر حیرانی کی بات ہے کہ خود خان صاحب نے اپنے موقف پر بزعم خود جو دلائل دیئے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی قبر کا لفظ نہیں ہے۔ اگر کسی کو ہماری اس بات سے اختلاف ہے تو مناظرہ سے قبر کی صراحت کے ساتھ پیش کی گئی خان صاحب کی دلیل نکال کر دِکھائے۔

(۲) خان صاحب نے کہا:

’’پہلے اپنے عقیدہ کو آیت سے جو نص قطعی الثبوت کے ساتھ قطعی الدلالت بھی پیش کرو‘‘ **انتھی**

دوسروں سے ’’قطعی الدلالت‘‘ کا مطالبہ کیا مگر بزعم خود جو دلائل دیئے ان میں کوئی دلیل ایسی نہیں ذکر نہیں کی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبر میں مردہ ہونے پر قطعی الدلالت ہو، نہ صرف یہ کہ قطعی الدلالت نہیں بلکہ ان سے اپنا مطلب زبردستی کشید کیا۔

(۳) خان صاحب اپنی کتاب ’’**دَمْدَمَةُ الْجُنُوْدِ**‘‘ میں مخالف کے متعلق لکھتے ہیں:

’’قرآنی آیات کو گھڑنتو معنی پہنا کر من مانی تاویلیں کرتے ہیں اور تفسیر کرتے ہیں۔‘‘ (**دَمْدَمَةُ الْجُنُوْدِ**:۱۸)

مگر خود خان صاحب کا اپنا طرز مناظرہ میں یہی رہا کہ قرآنی آیات کی من مانی تفسیر کی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تائید میں کسی مفسر کا حوالہ باوجود مطالبہ کے نہیں پیش کر سکے۔

(۴) خان صاحب نے ایک روایت کے متعلق لکھا:

’’اس میں ایک راوی ابو معاویہ ضریر ہے، وہ بھی خیر سے غالی شیعہ، جس کی نماز جنازہ پڑھنے سے بہت سارے محدثین نے انکار کر دیا تھا... اعمش بھی تدلیس کا مریض ہے۔‘‘ (**دَمْدَمَةُ الْجُنُوْدِ**:۳۹)

دوسری طرف مناظرہ میں روایت پیش کی، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فیصلہ کتاب اللہ سے کرو، اگر مسئلہ اس میں نہ ہو تو حدیث کی طرف آؤ۔ (مفہوم)

حالاں کہ اس روایت کی سند میں یہی دونوں ابو معاویہ ضریر اور اعمش موجود ہیں جن کی بنیاد پر وہ مخالف کی دلیل کو ’’**دَمْدَمَةُ الْجُنُوْدِ**‘‘ میں رَد کر چکے ہیں۔ اوکاڑوی صاحب نے مناظرہ میں ان کا تضاد اور دوہرا معیار ذِکر کیا مگر خان صاحب اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔

نرالی تحقیق یا چتروڑی تحقیق ؟

علامہ احمد سعید خان صاحب کی تحقیقات کو ان کے بہت سے معتقدین نرالی اور معیاری سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے جو محمد الفضا دمماتی صاحب نے بیان کی ہے وہ خان صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولانا اشاعۃ التوحید والسنۃ پاکستان کے نامور مبلغ اور مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔لیکن بدنصیبی سے روزِ اول سے ہی پوری جماعت کا موضوع بن گئے ،کہیں ان کی اخلاق سے گری گفتگو کی شکایت زیرلب ہوتی اور کہیں مجلس مقننہ کے فیصلوں کی خلاف ورزی ،کہیں اُن کی نئی نئی تحقیقات کا تذکرہ ہوتا۔''

(خس کم، جہاں پاک:۹،مطبوعہ اشاعۃ التوحید والسنۃ لالہ موسیٰ)

خان صاحب نے مناظرہ میں بھی نئی نئی تحقیقات کا مظاہرہ فرمایا ہے ، چند تحقیقات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)اوکاڑوی صاحب نے ایک حدیث کا متواتر ہونا علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی زبانی نقل کیا تو خان صاحب نے کہا:

''سیوطی ناقل ہے،نقاد نہیں۔''

حالاں کہ اصول حدیث اور فن رجال سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ کا شمار نقاد محدثین میں ہوتا ہے، انہوں نے نقد رجرح و تعدیل میں:''طبقات الحفاظ''،''ذیل طبقات الحفاظ'' کتابیں تصنیف کی ہیں۔

(۲)عبادت کی دو قسمیں ہیں۔(الف) تکلیفی : جنہیں بندوں پر لازم کیا گیا جیسے نماز روزہ وغیرہ۔(ب) غیر تکلیفی :اور یہ وہ عبادات ہیں جن کے کرنے کا انسان کو مکلّف نہیں بنایا گیا جیسے جنتی لوگوں کا جنت میں اللہ کی حمد وثناء کرنا ہوگا۔**وقالوا الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن** ،وہ کہیں گے تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہم سے غم کو دور کردیا۔(سورۃ فاطر،آیت:۳۴)

اوکاڑوی صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: انبیاء کرام کا قبروں میں نماز پڑھنا عبادت غیر تکلیفی کی قبیل سے ہے اور'' **واعبد ربک حتی یاتیک الیقین** ''میں جو موت تک عبادت کا حکم ہے وہ دنیا والی تکلیفی عبادت کا ذِکر ہے، انبیاء علیہم السلام کی تکلیفی عبادت تو ان کی موت پر ختم ہوگئی، البتہ قبروں میں نماز پڑھنا غیر تکلیفی موت کے بعد ہے۔

خان صاحب نے اس کے جواب میں کہا:

’’باقی عبادت تکلیفی اور عبادت تلذوذیہ (محض لذت والی، غیر تکلیفی) ان کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں، اسلام میں ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے۔‘‘ **انتھی**

خان صاحب اگر ایسی تقسیم کے قائل نہیں ہیں تو ہمارا سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت تک عبادت کا حکم دیا ہے مگر جنتی حضرات جنت میں جو اللہ کی حمد و ثناء کریں گے، کیا وہ عبادت موت کے بعد کی نہیں؟ اگر جنت والی عبادت ’’ **واعبد ربک حتی یاتیک الیقین** ‘‘ کے خلاف نہیں تو قبر میں انبیاء کرام کا نماز پڑھنا بھی خلاف نہیں۔

(۳) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قبر میں نماز پڑھنے والی حدیث کا جواب دیتے ہوئے خان صاحب نے کہا:

’’ثابت تو کرنا ہے کہ حضرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام قبروں میں زندہ ہیں، یہ (اوکاڑوی صاحب) ثابت کر رہے ہیں، نماز پڑھنا‘‘ **انتھی**

خان صاحب! کیا نماز پڑھنا زندگی کی دلیل نہیں؟ کیا یہ مُردوں کا عمل ہے؟ کیا آپ کے نزدیک مردے نماز پڑھا کرتے ہیں!!؟

(۴) خان صاحب نے یہ بھی کہا کہ اگر قبر میں نماز پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اور یہ حیات کی دلیل بنی تو آپ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ دیگر انبیاء کو تو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا وہ تو قبروں میں مردہ ہوئے۔‘‘ **انتھی**

اہل علم جانتے ہیں کہ یہ انتہائی بے جان سی بات ہے، دیگر انبیاء علیہ السلام کے قبروں میں نماز پڑھنے کی اس میں نفی نہیں ہے، جب کہ دوسری جگہ صراحۃً حدیث میں آیا ہے کہ انبیاء کرام قبروں میں نماز پڑھا کرتے ہیں۔ اُوکاڑوی صاحب نے یہ جواب دے کر ان کے قیاس باطل ربھدی تحقیق کو رَد کر دیا تھا، جس کا خان صاحب سے کوئی جواب نہیں بن پایا تھا۔

حرفِ آخر

اب رہی یہ بات کہ مناظرہ میں کون جیتا، کون ہارا؟ یہ تو ہر شخص مناظرہ سن یا پڑھ کر جان سکتا ہے۔ ہم اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں سناتے، البتہ خان صاحب کا اعتراف نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں اُنہوں نے دَوران مناظرہ متعدد بار اُوکاڑوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا:

’’آپ تو روایت کے بعد روایت اور حدیث کے بعد حدیث پڑھتے جا رہے ہیں۔‘‘

رب نواز عفا اللہ عنہ، مدرس: جامعہ فتحیہ، احمد پور شرقیہ ضلع بہاول پور

۹ ررمضان المبارک: ۱۴۳۴ھ

عقیدہ حیات النبیؐ: زندہ باد　　　یا اللہ مدد　　　خلافت راشدہ: حق چار یارؓ

یٰایھا الذین آمنوا ان جاء کم فاسق بنبإٍ فتبینوا.[القرآن]

آیۃ المنافق ثلاث: اذا حدث کذب، واذا عاھد غدر، واذا خاصم فجر.[الحدیث]

ایک مناظرہ جو نہ ہو سکا...!

مناظرہ سے فرار کے لیے مولوی خضر حیات بھکروی کی دھوکہ دہی اور غنڈہ گردی واقعہ کا پس منظر، حالات و واقعات، حقائق کیا ہیں؟

اشاعتی مولوی کی ''اخلاقیات'' کے نمونے، مماتی فتنہ، بدزبان مولوی کی کھوکھلی چیلنج بازی، اہل حق کی طرف سے چیلنج قبول کیے جانے پر چالاکی، ۲۰۱۸ء میں مناظرے سے فرار ہونا، ۱۹/جون ۲۴ء کے مناظرے کے حوالے سے جانبین کے پیغامات، مناظرے کا موضوع اور مماتی قلابازیاں، بڑھکیں اور چالبازیاں، مناظرے کا وقت، جگہ اور شرائط طے کرنے کی پیشکش اور مماتیوں کی دھوکہ دہی، حملے کی غنڈہ گردی اور تقدس مسجد کی پامالی، شور شرابے کے بعد فرار اختیار کرنا، اپنوں کی ''مہربانیاں'' اور اہل حق کا چیلنج

مناظر اہل سنت، وکیل احناف

مولانا محمد انصر باجوہ

جامع مسجد و مدرسہ امام اعظم ابوحنیفہ، بنی سٹاپ، چکری روڈ، راولپنڈی

ناشر: جامعہ خلفائے راشدین، فیصل آباد

0303-6827313

اشاعتی (مماتی) مولوی خضر حیات کی ''اَخلاقیات'' کے چند نمونے

۱......(مسجد کے منبر پر کہتا ہے:) تم نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے کسی کتیا کا نہیں پیا تو......!

۲......(مسجد میں ہی کہتا ہے:) تمہاری ماں کو ٹیوشن پڑھانے والے۔

۳......جن دس حیاتی مناظرین کے میں نے نام لیے، یہ سب بے غیرت بنے ہوئے ہیں۔

۴......منیر احمد منور، انور اوکاڑوی اِن دو مجرموں کو ذرا میرے سامنے تو لاؤ۔

۵......تمہارا باپ تمہارے منبر پر کھڑا ہے۔

۶......اوئے وَڑا بچے! لا اپنے باپ اَنور اوکاڑوی کو لا!

۷......''فضائل اعمال'' میں بہت سارے گپ ٹیشن ہیں، جھوٹ ہیں۔

۸......''معارف القرآن'' میں دوسو (۲۰۰) سے زیادہ زبردست جھوٹ لکھے ہیں۔

۹......مفتی تقی نے منبر پر بیٹھ کر جھوٹ بولا، بزرگ بڑا جھوٹ بھی بڑا، یہ بزرگ ہے یا گرگ ہے۔

۱۰......موجودہ حیاتیے (عقیدہ حیات النبی کے قائلین) مشرک و مرتد ہیں، اہل کتاب نہیں۔

۱۱......زمینی قبروں میں انبیاء کی حیات کا عقیدہ یہودی عقیدہ ہے، جو شرک کا دروازہ ہے۔

۱۲......جو یہ عقیدہ رکھے کہ قبر کے پاس پڑھا جانے والا صلوٰۃ وسلام نبی سنتے ہیں، وہ کافر ہے۔

۱۳......المہند کو ''معیارِ ایمان'' کہنے والے پکے کافر، ''معیارِ اہل سنت'' کہنے والے پکے بدعتی ہیں۔

۱۴......جو دیوبندیت کو دین و مذہب سمجھتا ہے، خدا کی قسم وہ مرتد ہوسکتا ہے مسلمان نہیں ہوسکتا۔

۱۵......ہندوؤں کے شہر دیوبند کے مدرسہ میں نیک لوگ بھی پڑھے ہیں، اور بدترین مشرک بھی!

۱۶......رائے ونڈی فرقہ خالص دجالی، طاغوتی ترجمان ہے، دین محمدی کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۷......شیطان کا سب سے مقبول اور اُس کا سب سے کارآمد گروہ یہی رائے ونڈی فرقہ ہے۔

۱۸......رائے ونڈ والوں کی توحید ابوجہل والی ہے۔

۱۹......دجالی گروہ (تبلیغی جماعت) پر پابندی لگانے پر ہم سعودی حکومت کو مبارک پیش کرتے ہیں۔

۲۰......بڑے پیٹ والا مولوی (مولانا فضل الرحمٰن) مرزا قادیانی سے دس گنا بڑا مرتد ہے۔

(نوٹ: اِن تمام باتوں کی ریکارڈنگز محفوظ ہیں۔ جو طلب کرنے پر مہیا کی جاسکتی ہیں۔)

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، امابعد!

عقیدہ حیات النبی اور اُس کے منکرین (مماتی فتنہ):

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی زمینی قبروں میں روح کے تعلق کے ساتھ حیات ہیں، اِس عقیدہ کو ''عقیدہ حیات النبی'' کہا جاتا ہے۔ یہ اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاقی عقیدہ ہے، جو ضروریاتِ اہل سنت میں سے ہے۔ اِس عقیدے کا منکر اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج، بدعتی، گمراہ اور خراب عقیدے والا ہے۔

اپنے آپ کو اہل سنت کہلوانے والوں میں اِس عقیدے کے پہلے منکر سید عنایت اللہ شاہ بخاری (گجرات) ہیں، جن کی ''جامعہ خیر المدارس، ملتان'' کی ایک تقریر سے یہ فتنہ شروع ہوا، اَب اِس فتنے کی عمر تقریباً ۷۰ رسال ہوگئی ہے۔

علمائے اہل سنت دیوبند خصوصاً امام المؤحدین، رئیس المفسرین مولانا حسین علی رحمہ اللہ تعالیٰ [واں بھچراں] کا نام استعمال کرنے والے ''جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ'' کے لوگ اِس فتنہ کا شکار ہیں۔

مماتی فتنے کا ایک بدزبان مولوی اور اُس کی کھوکھلی چیلنج بازی:

اِس فتنہ کے ایک انتہائی بدزبان مولوی خضر حیات (جس کو خضر واہیات کہنا زیادہ قرین انصاف ہے) نے عرصۂ دراز سے علمائے اہل سنت دیوبند کے خلاف زبان درازی اور چیلنج بازی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ آئے روز مناظروں کے چیلنج کرنا، اپنے لوگوں میں بیٹھ کر بڑھکیں مارنا، خود کو بڑا تیس مار خان باور کرانا اور بدتہذیبی وبدتمیزی کی تمام حدود پار کرنا موصوف کی عادت بن چکی ہے۔ لیکن جب ہمارے حضرات مولانا عبداللہ عابد وڑائچ وغیرہ کی طرف سے مولوی خضر حیات کے چیلنج کو قبول کرکے مناظرے کا کہا گیا تو آئیں بائیں شائیں کے علاوہ کوئی جواب نہیں ملا۔

ہماری طرف سے چیلنج قبول کیے جانے پر مولوی خضر حیات کی چالاکی:

ہماری طرف سے چیلنج قبول کرنے کے بعد مولوی خضر حیات نے اپنے حلقہ کے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے یہ منصوبہ بنایا کہ: اپنے ہم عمر علماء کے بجائے اہل سنت دیوبند کے عمر رسیدہ علماء ومشائخ کو چیلنج کروں، نہ وہ مقابلے میں آئیں گے، نہ مجھے مناظرہ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اس نے مناظر اسلام مولانا مفتی انور اوکاڑوی، شیخ الحدیث مولانا عبدالقدوس خان قارن، شیخ الحدیث مولانا منیر احمد منور، وکیل احناف مولانا عبدالحق خان بشیر، مفتی ابن مفتی مولانا مفتی سید عبدالقدوس ترمذی، مناظر ابن مناظر مولانا عبدالغفار تونسوی مدظلہم وغیرہم کے نام لینا شروع کردیئے کہ میرے ساتھ مناظرہ کرنا ہے تو یہ لوگ آئیں۔

ظاہر ہے کہ اِن حضرات کے سامنے مولوی خضر حیات کل کا بچہ ہے، نہ عمر میں برابری، نہ علم میں کوئی تناسب، نہ عمل کا کوئی تقابل اور سب سے بڑھ کر شرافت وتہذیب میں بالکل متضاد۔ لہٰذا ہماری طرف سے دیگر علماء مسلسل مولوی خضر حیات کے چیلنج کو قبول کرتے رہے۔ لیکن مولوی خضر حیات نے زندگی بھر کوئی مناظرہ کیا نہ اُسے مناظرے کا سلیقہ ہے، اِس لیے وہ کبھی بھی مناظرے کے لیے تیار نہیں ہوا۔

۲۰۱۸ء میں مولوی خضر حیات کا مناظرے سے فرار:

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اُس کی بدزبانی اور چیلنج بازی مسلسل جاری رہی۔ چنانچہ مجبوراً ہم نے ۲۰۱۸ء میں مولوی خضر حیات کے پیش کردہ ناموں میں سے دو حضرات استاذِ مکرم مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی اور استاذِ مکرم مولانا منیر احمد منور مدظلہما سے عرض کیا کہ مماتی مولوی خضر حیات سے مناظرہ کے لیے آپ کو تکلیف دینی ہے، تو دونوں حضرات نے فرمایا کہ: ہم اس کے لیے بالکل تیار ہیں۔ جب بھی کہیں، ہم اس سے مناظرہ کرلیں گے۔ (اللہ پاک جزائے خیر دیں ہمارے اکابر کو کہ اُنہوں نے اپنے مقام ومرتبہ کو نہیں دیکھا، بلکہ مسلکِ اہل سنت کو مقدم رکھا۔ اور جو شخص کسی بھی درجے میں اُن کا مقابل نہیں ہوسکتا، اُس سے گفتگو کے لیے بھی تیار ہوگئے۔)

لیکن اُس وقت مولوی خضر حیات نے مناظرے کی حامی نہیں بھری، بھرتا بھی کیسے، اُسے تو مناظرہ کرنا ہی نہیں، صرف بڑھکیں مارنی ہیں اور اپنے لوگوں میں اپنے آپ کو شیر کہلوانا ہے۔ چنانچہ اُس وقت مناظرہ نہ ہوسکا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ: جن حضرات کا نام خود مولوی خضر حیات نے پیش کیا تھا، وہ جب مناظرے کے لیے تیار ہوگئے تو مولوی خضر حیات بھی تیار ہوجاتا، یا پھر چیلنج بازی اور بدزبانی ترک کردیتا۔ لیکن کہتے ہیں کہ: ''عادت سر کے ساتھ جاتی ہے۔'' چنانچہ مولوی خضر حیات کی بڑھکیں مارنے، چیلنج بازی کرنے اور زبان درازی کرنے کی عادت کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔

مولوی خضر حیات کو مناظرے میں بٹھانے کی ایک اور کوشش:

چنانچہ ہم نے سوچا کہ: ایک کوشش اور کرکے دیکھتے ہیں، لہٰذا بندہ نے مولانا مفتی انور اوکاڑوی اور مولانا منیر احمد منور مدظلہما کو مولوی خضر حیات کے چیلنج بازی پر مبنی اقتباسات سنوائے، تو اُنہوں نے حسبِ سابق شفقت فرمائی اور کہا کہ: ہم اس کے ساتھ مناظرے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ بندہ نے حضرت مفتی انور اوکاڑوی مدظلہ سے عرض کیا کہ: بڑی عید کی تعطیلات میں اگر آپ کے پاس وقت ہو تو دو تین دِن ہمیں عنایت فرمادیں، استاذِ مکرم نے عید کے تیسرے دِن سے تین دن عنایت فرمادیئے، **جزاہ اللہ خیرا۔**

۲۵ رمئی ۲۰۲۴ء کو مولوی خضر حیات کے نام میرا (محمد انصر باجوہ کا) جاری کردہ پیغام:

۲۵ رمئی ۲۰۲۴ء میں نے مولوی خضر حیات کے نام پیغام جاری کیا تھا کہ مولانا منیر احمد منور یا مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی مناظرے کے لیے تشریف لائیں گے، مولوی خضر حیات تیار ہو جائے۔

نیز بتایا تھا کہ دو ماہ کی مہلت ہے، دو ماہ کے اندر میرے پیغام کا جواب دے۔

مناظرے کا موضوع بھی بتا دیا تھا کہ مناظرے کا موضوع ہوگا: ''دیوبندی کون؟''

۱۵ رجون ۲۰۲۴ء کو میرا (محمد انصر باجوہ کا) جاری کردہ پیغام:

استاذِ مکرم سے تاریخیں ملنے کے بعد ۱۵ رجون کو میں نے مولوی خضر حیات کے نام ایک اور پیغام جاری کیا، جس میں یہ بھی بتا دیا کہ: ۱۹، ۲۰، ۲۱ رجون ۲۰۲۴ء بروز بدھ تا جمعہ مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی صاحب یہاں پنڈی میں ہوں گے۔ لہٰذا مولوی خضر حیات مناظرے کی تیاری کر لے۔

اور مناظرے کا موضوع جو مئی میں بتایا جا چکا تھا، وہ بھی دُہرا دیا کہ مناظرے کا موضوع ہوگا: ''دیوبندی کون؟'' اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اگر مولوی خضر حیات دیوبندیت سے بیزاری کا اعلان کر دے اور آئندہ دیوبندیت کا نام استعمال نہ کرنے کی تحریر لکھ دے تو پھر اِس موضوع پر گفتگو کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لہٰذا پھر اگلا موضوع ہوگا: ''سماعِ موتیٰ شرک ہے یا نہیں؟''

مناظرے کا موضوع اور مولوی خضر حیات کی قلابازیاں:

علمائے اہلِ سنت دیوبند کے خلاف مولوی خضر حیات کی بدزبانیاں اور چیلنج بازیاں عقیدہ حیات النبی کے حوالے سے ہوتی تھیں، نیز اُس کا دعویٰ ہے کہ: سماعِ موتیٰ کا عقیدہ شرک اور اس کے قائلین ابوجہل کی طرح مشرک ہیں۔ اِس کے علاوہ وہ اکابر اہلِ سنت دیوبند کی طرف اپنی نسبت کرتا ہے اور بڑی ہٹ دھرمی سے ہمیں اکابر دیوبند کا باغی کہتا ہے۔ چنانچہ ہم نے خضر حیات سے مناظرے کے لیے یہی موضوعات منتخب کیے جن پر اس کی بڑھکیں، چیلنج بازیاں اور بدزبانیاں تھیں۔

[۱]۔ عقیدہ حیات النبی۔ [۲]۔ سماعِ موتیٰ کا عقیدہ شرک ہے یا نہیں؟ [۳]۔ دیوبندی کون؟

جب مولوی خضر حیات کی بڑھکیں، چیلنج بازیاں اور بدتہذیبیاں ان موضوعات کے حوالے سے ہیں تو اُسے چاہیے تھا کہ اِن موضوعات پر مناظرے کے لیے تیار رہتا، اور اگر اِن موضوعات پر مناظرہ نہیں کر سکتا تو اِن موضوعات پر اپنی زبان کو بند رکھتا۔ لیکن اُس نے نہ زبان روکی، نہ مناظرے کی ہمت کر سکا۔

بلکہ اُس نے ایک اور چال چلی، اور مناظرے کے موضوع سے بدکنے لگا، کبھی پھدک کر ایک موضوع کی طرف، کبھی دوسرے کی طرف اور کبھی تیسرے کی طرف! کبھی کہا کہ: مناظرہ ''سماع الاموات'' پر

ہوگا۔ کبھی کہا: مناظرہ ’’سماع الاموات عادۃً‘‘ پر ہوگا۔ کبھی کہا: مناظرہ ’’معیارِ اُلوہیت‘‘ پر ہوگا۔ کبھی کہا: مناظرہ ’’المہند‘‘ پر کرلو۔ کبھی کہا: ’’دیوبندیت کو معیارِ اہل سنت‘‘ سمجھتے ہو تو اس پر مناظرہ کرلو! کبھی کہا کہ: کوئی سے چار اکابر دیوبند کے نام لو، اُن کی تمام عبارات کو درست تسلیم کرو، تو اُنہی کی عبارات سے تمہیں ابوجہل جیسا مشرک اور تمہاری عبارتوں سے اُن کی تکفیر ثابت کروں گا۔ اور ہر مرتبہ ویسے تو اپنے عقیدت مندوں میں بیٹھ کر خوب بڑھکیں ماریں، للکارے مارے، لیکن موضوع کی بات آئی تو ہر مرتبہ یہی کہا کہ: ’’موضوع متعین ہے۔‘‘

مولوی خضر حیات کی پریشانی اور اُس کا خود ساختہ حل:

مولوی خضر حیات کو پریشانی یہ تھی کہ کہیں مجھے مناظرے میں بیٹھنا ہی نہ پڑ جائے، اِس لیے حفظ ما تقدم کے طور پر پریشانی کا حل اُس نے یہ نکالا کہ: کئی موضوعات کا نام لے دوں، تاکہ اگر کبھی بیٹھنے کی نوبت آ بھی جائے تو موضوع پر ہی جھگڑا ختم نہ ہو، اور گفتگو کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ مولوی خضر حیات کی جاری کردہ مختلف وڈیوز میں مذکورہ بالا تمام موضوعات کا تذکرہ سنا جاسکتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

[۱]۔ اَب تو انہوں نے ماشاءاللہ موضوع بھی زبردست متعین کیا: سماع الاموات، آہاہاہا، زبردست!

[۲]۔ سب سے پہلے میں: الٰہ اور معیارِ اُلوہیت سے بات شروع کروں گا۔ موضوع متعین ہے۔

[۳]۔ سماع الاموات عادۃً پہ مناظرہ ہوگا پہلا۔

[۴]۔ اپنی مرضی کے چار اکابر دیدو، اور کہیں کہ ہر عبارت پر ہمارا ایمان ہے۔ تو اِن شاءاللہ انہی چار بزرگوں کی عبارات سے تمہیں ابوجہل جیسا مشرک ثابت کروں گا۔

[۵]۔ اگر تم دیوبندیت کو ایمان کی شرط سمجھو، معیار سمجھو یا اہل سنت کا معیار سمجھو تو پھر تیار ہو جاؤ۔

[۶]۔ اگر المہند معیارِ دیوبندیت ہے تو تم پکے غیر دیوبندی ہو۔ تو المہند کو مقرر کرلو۔

قارئین! اندازہ لگائیں کہ اَبھی مناظرے میں بیٹھنے کی نوبت نہیں آئی اور مولوی خضر حیات کی قلابازیاں پہلے شروع ہوگئیں۔ صرف اِسی پر بس نہیں، بلکہ اُس نے باقاعدہ مطالبہ کیا کہ: مفتی انور اوکاڑوی صاحب اور مولانا منیر منور صاحب یہ کلپ ریکارڈ کروائیں کہ ’’مسئلہ الٰہ‘‘ اور ’’سماع الاموات‘‘ سے مناظرہ شروع ہوگا۔ پھر میں تیار ہوں۔ حد ہوگئی ہے ویسے! پھکڑ بازیاں، دشنام طرازیاں اور چیلنج ’’حیات النبی‘‘ اور ’’اکابر کا باغی کون؟‘‘ پر اور مناظرے کی باری آئی تو مسئلہ الٰہ اور معیارِ الوہیت! واہ خضروا ہیات واہ!

مولوی خضر حیات کے جاری کردہ دو پیغامات: بڑھکیں اور چالبازیاں

ہم نے ۲۵رمئی ۲۰۲۴ء اور ۱۵رجون ۲۰۲۴ء کو مولوی خضر حیات کے نام پیغامات جاری کرکے بتایا

تھا کہ اُس کا چیلنج قبول ہے۔ مفتی انور صاحب ۱۹ر تا ۲۱ر جون پنڈی میں ہوں گے۔ تو مولوی خضر حیات کی طرف سے دو پیغامات جاری کیے گئے، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

پہلا پیغام:

ہمارے فریق مخالف نے اعلان کیا ہے کہ وہ انور اوکاڑوی کو پیش کریں گے، یہ میری دلی تمنا تھی، ہم بہترین جگہ کا انتظام بھی کریں گے، کرایہ بھی دیں گے، نسوار کا خرچہ بھی دیں گے، زائد دیہاڑی بھی دیں گے جو مزدور کی ہوتی ہے۔ ہم سے لاکھ روپیہ طلب کیا گیا ہے، ہم ڈیڑھ لاکھ دیں گے۔ جو شخص ان دونوں کو میرے سامنے بٹھائے گا، اسے ایک لاکھ روپیہ انعام بھی دیں گے۔ باقی رہے چھوٹے چھوٹے شتونگڑے، اُن کے لیے ہمارے شاگرد ہی کافی ہیں۔

ان دونوں حضرات سے بھی گزارش ہے کہ یہ دعوت قبول کریں، میدانِ مناظرہ میں آئیں، ہم آپ کے مقام کے مطابق آپ کا اکرام کریں گے، آپ کی توہین بھی نہیں کریں گے، بات دلائل کی ہوگی، علماء کی زبان استعمال ہوگی، میں چاہتا ہوں روز روز کے جھگڑے ختم ہوں، ایک مرتبہ حتمی مناظرہ ہو جائے، ماحول صاف ہو جائے، ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ امت میں انتشار نہ ہو، فساد نہ ہو، اَب تو انہوں نے ماشاء اللہ موضوع بھی زبردست متعین کیا۔ سماع الاموات۔ آہاہاہا۔ زبردست! پخیر راغلے، جی آیاں نوں!

دوسرا پیغام:

مولانا انور اوکاڑوی صاحب! اگر آپ واقعی افہام و تفہیم یا مناظرے کے لیے تیار ہیں تو جیسے میں یہ کلپ دے رہا ہوں ایسے ہی آپ خود بنفس نفیس ایک پیغام ریکارڈ کرائیں جس میں آپ باقاعدہ چیلنج کریں اور کہیں کہ ''مسئلہ الٰہ'' اور ''سماع الاموات عادۃً'' پر مناظرے کے لیے ہم تیار ہیں۔

اور پنڈی میں قاضی عبدالرشید صاحب یا ڈاکٹر عتیق الرحمٰن صاحب یا وفاق المدارس کے مسئول کو اپنا ترجمان بنائیں جو اسلام آباد کے ہمارے امیر قاری دلاور خان صاحب سے رابطہ کر لیں، مجہول الاصل والنسل بازاری قسم کے لوگوں کو اپنا ترجمان مت بنائیں، ان مجہولوں سے بچیں۔

اور موضوع مناظرے کا متعین ہے: سب سے پہلے معیارِ الوہیت اور مسئلہ الٰہ سے بات شروع ہوگی، تاکہ پتہ چلے کہ تم مسلمان بھی ہو یا نہیں۔

کہتے ہیں کہ: ''دیوبندی کون ہے؟'' پر مناظرہ ہوگا، یہ کون سا موضوع ہے؟ پہلے تم اپنے آپ کو مسلمان تو ثابت کرو۔ ہمارا دعویٰ مسلمان ہونے کا ہے۔ دیوبندیت نہ ایمان کا رکن ہے، نہ ایمان کی شرط ہے، نہ اہل سنت کا معیار ہے۔ دیوبند ایک مدرسہ ہے۔ اگر آپ دیوبندیت کو معیارِ ایمان یا معیارِ اہل سنت

سمجھتے ہیں تو پھر اس پر مناظرہ ہوگا۔

اگر ''المہند'' کو تم معیارِ ایمان، یا معیارِ اہل سنت، یا معیارِ دیوبندیت سمجھتے ہو تو اسے مقرر کرلو، میں ثابت کروں گا کہ: اگر المہند معیارِ ایمان ہے تو تم کافر ہو، اگر المہند معیارِ اہل سنت ہو تو تم پکے اہل بدعت ہو، اور اگر المہند معیارِ دیوبندیت ہے تو تم پکے غیر دیوبندی ہو۔

میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ: اپنی مرضی کے چار اکابر دیوبند کے نام لے کر دستخط کردو کہ ان کی ہر عبارت پر ہمارا اِیمان ہے تو اُنہی چار بزرگوں کی عبارات سے تمہیں ابوجہل جیسا مشرک ثابت کروں گا، پتہ چل جائے گا کہ دیوبندیت کیا ہے؟

الوہیت کے معیار کے تعین کے بعد ''سماع الاموات عادۃً'' پر مناظرہ ہوگا۔

ہم چاہتے ہیں کہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اچھے ماحول میں بات ہو، آپ افہام و تفہیم کرنا چاہیں تب بھی چشم ما روشن دِل ما شاد! اور اگر آپ مناظرے کی کبڈی کرنا چاہیں تو ان شاء اللہ اس کے لیے بھی ہم تیار ہیں۔

۱۹/جون بروز بدھ کو مولانا وڑائچ اور مفتی انور صاحب کے پیغامات:

۲۵/مئی اور اس کے بعد ۱۵/جون کو ہماری طرف سے اعلان ہوگیا۔لیکن اُن کی طرف سے کسی نے مقام مناظرہ یا شرائط کے لیے رابطہ نہیں کیا۔صرف دو پیغامات جاری کیے گئے، جن میں

۱۔موضوع کے ہیر پھیر کی کوشش کی گئی۔

۲۔فرار کے لیے اپنے من پسند موضوعات پر مناظرے کے چیلنج کا فضول مطالبہ کیا گیا۔

۳۔اپنے نمائندے تبدیل کرنے کا بے جا مطالبہ کیا گیا۔

حسبِ اعلان ۱۹/جون بروز بدھ کو استاذِ مکرم مناظر اسلام مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہم اور شیر اسلام مولانا عبداللہ عابد وڑائچ مدظلہ پنڈی میں ہمارے ہاں پہنچ گئے اور دونوں حضرات نے مولوی خضر حیات کے نام درج ذیل پیغامات جاری کیے۔

حضرت مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہم کا پیغام:

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم.

کچھ عرصہ پہلے مولانا انصر صاحب نے خضر حیات کی کیسٹ (ریکارڈنگ) مجھے بھیجی کہ تقریر میں کہہ رہا ہے کہ:

مولوی منیر اور مولوی انور میرے سامنے آکر بات کریں۔ وہ بات کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔اگر وہ آجائیں تو بہت اچھا ہے۔اَب سنا ہے

کہ: انہوں نے یہ کہا ہے کہ: ایک لاکھ روپے ہمارا خرچہ ہوگا۔ہم نے کہا کہ:

ہم ڈیڑھ لاکھ دینے کے لیے تیار ہیں اور سارا اِنتظام کریں گے۔

جبکہ اِن کے ساتھیوں نے بتایا کہ: بارہ (۱۲) سال سے یہ چیلنج بازی کر رہے ہیں، اور مجھے پتہ بھی نہیں تھا۔اَب میں اِن کے بلانے کے مطابق مولانا انصر صاحب کے پاس آ گیا ہوں ۔اَب جیسے وہ آنا چاہیں آجائیں۔آج انیس (۱۹) جون ہے۔اور دو ہزار چوبیس (۲۰۲۴ء)۔

مولانا عبداللہ عابد وڑائچ صاحب کا پیغام:

خضر حیات صاحب بار بار ہمارے اکابر کے بارے میں بدزبانی کرتے تھے، اِس پر جب اُنھیں روکا گیا یا اُنھیں گفتگو کرنے کا کہا گیا تو اُن کا یہ مطالبہ تھا کہ: مفتی محمد انور اوکاڑوی صاحب میرے ساتھ گفتگو کریں۔تو آج بتاریخ ۱۹؍جون ۲۰۲۴ء بروز بدھ الحمد للہ مفتی محمد انور اوکاڑوی صاحب، مولانا انصر باجوہ صاحب کے پاس تشریف لا چکے ہیں۔اور خضر حیات صاحب کی خدمت کے لیے میں یعنی عبداللہ عابد وڑائچ، میں بھی پہنچ چکا ہوں۔ہمارے اور علمائے کرام بھی تشریف فرما ہیں، اِن شاء اللہ تین دِن تک خضر حیات صاحب کا ہم انتظار کریں گے، اگر اُن میں ہمت ہے تو آ کر گفتگو کریں۔

پہلے خضر حیات صاحب کا دعویٰ تھا کہ: اَڑتالیس (۴۸) مقامات پر دیوبندی (مناظرے سے) بھاگ گئے ہیں۔.... یہ بے چارے بارہ (۱۲) بجے کے لگ بھگ یہ دعویٰ کر رہے تھے، کہ دو بجے کے بعد میں نے چیلنج کر دیا کہ خضر حیات صاحب آئیں میرے ساتھ مناظرہ کریں، دیکھتے ہیں بھاگا کون ہے؟ ٹھہرا کون ہے؟ تو خضر حیات صاحب بیک وقت تین شہروں میں حاضر ناظر تھے، لیٹی میں، راولپنڈی میں اور ایک جگہ کا بھی ذکر تھا کہ حضرت وہاں ہیں۔فون کرنے والا ایک بندہ تھا، اور ہر پانچ پانچ منٹ کے بعد اور جگہ بتاتے تھے کہ میں وہاں ہوں۔نہ مناظرہ کیا زندگی بھر، نہ سلیقہ ہے مناظرہ کرنے کا، اور عام شریفانہ زبان ہی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے، مناظرہ اُنہوں نے کیا کرنا ہے۔بہرحال اُس کے بعد مناظرہ طے ہوا، مناظرے کی جگہوں پر گڑبڑ کی گئی، تا کہ مناظرہ نہ ہو، اور حکومتی اداروں سے انہوں نے تعاون لینے کی کوشش کی۔

ہم نے کبھی بھی پہل نہیں کی، لیکن اگر کوئی پہل کرے تو ہم اس کے گھر تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔خضر حیات صاحب! آپ کے شہر میں ہم آ چکے ہیں، ہمت ہے تو بسم اللہ کر کے سامنے تشریف لائیں۔

پھر خضر حیات صاحب کہتے ہیں کہ: ’’آپ مناظرے کا چیلنج کریں۔!‘‘ تو پھر آسمان گر جائے گا؟ میں چیلنج کرتا ہوں، کریں آپ میرے ساتھ مناظرہ اگر جرأت ہے تو۔

تف ہے ایسی زندگی پر کہ ساری زندگی بڑھکیں مارتے رہنا ہے، اور جب سامنے آؤ تو بھاگ جانا

ہے، پھر شرطیں لگا دیتی ہیں جی فلاں شرط ہوگی تو یوں ہوگا، فلاں کام ہوگا تو یوں ہوگا۔ بھئی! سامنے آ اور مناظرہ کرو!

دوسری بات! ڈنکے کی چوٹ ہم کہتے ہیں: ہم نے آپ کو اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج کہا ہے عقیدہ حیات النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بنیاد پر۔ آپ اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہیں، آپ کا اہل السنۃ والجماعۃ خصوصاً علمائے دیوبند سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔

ہمت ہے، عقیدہ حیات پہ آؤ، ہم آپ کی تسلی کرا کے بھیجیں گے۔

مفتی انور صاحب کے پیغام کے بعد مولوی خضر حیات کا پیغام:

اَب سے کچھ دیر پہلے جناب مفتی محمد انور اوکاڑوی صاحب کا ایک آڈیو کلپ شائع ہوا، سن کر بڑی خوشی ہوئی اور تعجب بھی ہوا۔ انیس دِن پہلے میں نے کلپ کا مطالبہ کیا تھا، لیکن انیس دِن تک انور اوکاڑوی صاحب منظر عام سے غائب رہے۔ کسی نے ہمارے امیر مولانا دلاور سے رابطہ نہیں کیا، نہ شرائط طے ہوئیں۔

اَنور اوکاڑوی صاحب نے اپنے کلپ میں ایک بہت بڑا جھوٹ اِرشاد فرمایا ہے، یہ ساری کمپنی جھوٹی ہے، سفید ریش بھی جھوٹ بولتے ہیں، کیا میزبان کیا مہمان! (قارئین! مفتی انور اوکاڑوی صاحب نے مولوی خضر حیات کی بات نقل کی ہے۔ جسے وہ اپنی جہالت اور کم سمجھی کی وجہ سے مفتی صاحب کی بات سمجھ بیٹھا اور ’’جھوٹ، جھوٹ‘ کی رٹ لگا دی۔ یہ تو اِس شخص کے فہم کا عالم ہے۔ ذرا مولوی خضر حیات اور اوکاڑوی صاحب کے گزشتہ پیغامات ایک مرتبہ پھر پڑھ لیں۔ [ناقل]) اوکاڑوی صاحب نے جھوٹ بولا کہ: ہم نے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے، ہمارے کسی ذمہ دار ساتھی سے ثابت ہو جائے تو دس لاکھ انعام دیں گے۔

ایک موضوع آپ کے مہمان نے متعین کر دیا ہے، چار اکابر دیوبند کی عبارات۔ حضرت شیخ الہند، حضرت مدنی، حضرت کشمیری، حضرت مولانا محمد زکریا رحمہم اللہ۔

کہتے ہیں: ہم پنڈی میں تشریف لائے۔ پنڈی میں آپ اللہ جانے کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کس کمرے میں چھپ کر بیٹھے ہیں؟ کسی غار میں چھپ کے کہنا: میں پنڈی میں بیٹھا ہوں، میں فلاں جگہ بیٹھا ہوں، اِس سے کچھ نہیں بنتا۔

ہمارے ساتھی آصف خان صاحب، سید انظر شاہ صاحب، قاری دلاور خان صاحب موجود ہیں، آپ اپنے نمائندگان کو حکم دیں کہ وہ اِن کے ساتھ مناظرہ کی جگہ، وقت اور شرائط طے کریں۔ موضوع متعین ہو چکا ہے، ہماری طرف سے موضوع: [۱] معیارِ الوہیت [۲] اور سماعِ اَموات عادۃً ۔ ہے۔ اگر آپ معیارِ الوہیت: لا الٰہ الا اللہ کا معنی نہیں کر سکے تو ان شاء اللہ ہم آپ کو کلمہ پڑھانے کے لیے بھی تیار ہیں۔ اَصل ہمارا

ہر فرقہ کے ساتھ خصوصاً آپ لوگوں کے ساتھ مسئلہ الہ میں ہے۔ آپ عادۃً سماع الاموات کے قائل ہیں۔ اور جو عادۃً سماع الاموات کا قائل ہو ہم اسے کٹر مشرک سمجھتے ہیں۔ اِس لیے ہمت کیجیے اور اپنا ایمان لا الہ الا اللہ پہ ثابت کیجیے! اَب اِدھر اُدھر کے ہاتھ پاؤں مارنے کی ضرورت نہیں۔

کہتے ہیں جی: بارہ سال پرانا چیلنج ہے، مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ عقیدہ تو پھر میرا ثابت ہوگیا، تمہارے نزدیک تو ہر مردے پر بھی عرضِ اعمال ہوتا ہے، اور پوری دنیا کو پتہ ہے اور میڈیا پر چل رہا ہے۔ تجھے بارہ سال تک جب پتہ نہیں چلا، زندہ کو پتہ نہیں چلا تو مردوں کو کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ عقیدہ تو ہمارا یہاں سے ہی ثابت ہوگیا۔ (قارئین! مولوی خضر حیات کی جاہلانہ علمیت کا اندازہ کرتے جائیں کہ: ایک شخص کو اِس دنیا میں ایک چیز کا علم نہیں، اِس بات سے مولوی خضر عالم برزخ میں مردوں کے سامنے عرض اعمال کی نفی پر استدلال کر کے اپنا عقیدہ ثابت کیے بیٹھا ہے۔ واہ خضر واہیات واہ!)

بہر حال میری گفتگو انور اوکاڑوی صاحب سے ہے، اُن کے چیلوں چانٹوں سے نہیں۔

آصف خان صاحب کا مکان متعین ہے، آپ اس سے فرار اختیار کر رہے ہیں۔ (قارئین! یہ بھی مولوی خضر حیات کا جھوٹ ہے، کیونکہ آصف خان نے پیش کش کی تھی کہ میرے مکان پر مناظرہ رکھ لیں، لیکن میں نے کہا کہ: تم تو خضر حیات کے مدرسہ کے طالب علم اور اُن کے خاص بندے ہو، تم کیسے غیر جانبدار ہوگئے؟ مولوی خضر حیات اس پیش کش کو ''مکان متعین ہے۔'' کہہ کر جھوٹ کی عادت پوری کر رہا ہے۔)

آپ خود آنا چاہیں تو میں خود آؤں گا، آپ اپنے نمائندے بھیجنا چاہیں تو میرے نمائندہ مفتی عثمان صاحب موجود ہیں۔ ان کے ساتھ جگہ، وقت اور شرائط طے کرو! موضوع متعین ہیں۔

اٹھتر (۷۸) وجوہ سے ماسٹر امین اوکاڑوی نے اکابر دیوبند پر یہودیت کا فتویٰ لگایا، آپ کی تصدیق موجود ہے، کبھی اکابرین دیوبند کو قادیانی کہا۔ شک ہو تو میری کتاب ''اکابر کا باغی کون؟'' دیکھ لیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اِس عمر میں ہدایت نصیب فرمائے۔

۲۰ر جون ۲۴ء: مولوی خضر حیات کی دھوکہ دہی اور غنڈی گردی:

۱۹ر جون بروز بدھ کو استاذِ مکرم مفتی انور صاحب اور مولانا عبداللہ عابد وڑائچ صاحب کی طرف سے مولوی خضر حیات کے نام پیغامات جاری ہوئے۔ اسی روز شام کو مولوی خضر حیات کا جوابی پیغام جاری ہوا، جو سابقہ صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے۔

جب مولوی خضر حیات نے یہ دیکھا کہ مفتی انور صاحب پنڈی میں تشریف لا چکے ہیں، اور انہوں نے اپنے اور مولوی خضر حیات کے مقام کے تفاوت کا خیال کرنے کے بجائے مسلک کو ترجیح دی ہے اور مناظرے کے لیے تیار ہیں تو اُس نے مناظرے سے جان چھڑانے کے ساتھ ساتھ اپنی ساکھ بچانے، اور

اپنے لوگوں میں بھرم قائم رکھنے کے لیے دھوکہ دھی اور غنڈہ گردی کا منصوبہ تیار کیا۔ اور وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو اِس سے قبل فتنہ مماتیت کے بانی عنایت اللہ شاہ صاحب بھی اختیار کر چکے تھے۔

ہمیں یہ یقین تو تھا کہ مولوی خضر حیات زہر کا پیالہ پی لے گا لیکن مناظرے کے لیے نہیں بیٹھے گا، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اِس طرح دھوکہ دھی اور غنڈہ گردی کر کے مناظرے سے جان چھڑائے گا۔ عید کی چھٹیوں کی وجہ سے مدرسہ بھی خالی تھا، ہم مدرسہ میں چار پانچ افراد تھے۔

مولوی خضر حیات اور اس کے نمائندوں سے مقام مناظرہ کی بات چیت چل رہی تھی، مولوی خضر حیات نے کہا کہ: آپ میرے ہاں آجائیں، ہم نے کہا: ہم آپ کی جگہ سے مطمئن نہیں ہیں۔ اُس نے جواب میں کہلوایا کہ: پھر ہم بھی آپ کی جگہ سے مطمئن نہیں ہیں، لہٰذا کسی تیسری جگہ کا انتخاب کیا جائے۔ ہم سے اُس نے یہ بات کہی، ابھی ہم تیسری جگہ کی سوچ بچار میں تھے کہ اگلے دِن ۲۰ ر جون بروز جمعرات مولوی خضر اپنے شاگردوں کی فوج ظفر موج لے کر ہماری مسجد میں آ گیا۔

ظاہر ہے کہ ابھی تک نہ مقام مناظرہ طے ہوا، نہ وقت متعین ہوا، نہ شرائط طے ہوئیں، نہ ہی اُس نے اطلاع دی کہ میں آپ کے ہاں آ رہا ہوں، اور بلا اطلاع اچانک اپنے غنڈوں کو لے کر مسجد پر دھاوا بول دیا، اور آ کر مسجد میں پہلے تو بیٹھ گیا، لیکن چند منٹ بعد مولوی خضر کے مزید لوگ ہماری مسجد میں پہنچ گئے تو مولوی خضر اُٹھ کھڑا ہوا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ صرف مزید افراد کے انتظار میں تھا، جیسے ہی مزید افراد آئے، اُس کے غنڈوں نے مسجد میں شور شرابا، نعرے بازی اور دشنام طرازی شروع کر دی۔ مولوی خضر حیات خود منبر پر چڑھ گیا، اور مولانا انور اوکاڑوی کے بارے میں بدزبانی کرنے لگا۔

ہم جو کرنے آئے وہ کریں گے، آپ کو پتہ چلے گا کہ ہم نے کیا کیا ہے: مولوی خضر

میں اور مولانا عبداللہ عابد وڑائچ صاحب گئے، مولوی خضر حیات سے ملے، اور اسے کہا کہ: ساتھیوں کو خاموش کرائے، آرام سے بٹھائے، اور ۲۰، ۲۰ ر افراد دونوں طرف کے بیٹھیں۔ باقی احباب کو واپس بھیج دے، تو مولوی خضر خود مجھے کہنے لگا کہ: ہم جس کام کے لیے آئے ہیں، ہم وہ کام کر کے جائیں گے، ہم آپ کو بتا کر جائیں گے کہ ہم نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے۔

اُن کے عمل سے معلوم ہوا کہ وہ صرف فوٹو شوٹنگ کے لیے، شور شرابے کے لیے اور نعرے بازی کے لیے آئے تھے، اِسی لیے اتنے لوگ ساتھ لائے تھے۔ اور یہ کام جب اُنہوں نے کر لیا تو وہ واپس چلے گئے۔ اگر مناظرے کے لیے آئے ہوتے تو کتابیں لاتے، مسجد میں آ کر مناظرے کی ترتیب کے مطابق بیٹھ جاتے۔ حالانکہ اُن کے پاس ایک بھی کتاب نظر نہیں آئی۔

مولانا عبداللہ عابد وڑائچ صاحب کو دیکھ کر مولوی خضر حیات ایک طرف کو چل دیا۔ وہ اسے بار بار

پکارتے رہے، لیکن وہ بیٹھنے تک کے لیے تیار نہیں ہوا، مناظرہ کیا کرتا۔

جب شور شرابا مکمل ہو جائے تو مناظرے کے لیے آ جائیں: مولانا مفتی محمد انور

اِسی دوران ایک مماتی اندر کتب خانے میں مفتی انور صاحب کے پاس گیا، (آصف خان کا کہنا ہے کہ میں گیا تھا۔) تو مفتی صاحب نے اُسے فرمایا کہ: آپ لوگ شور مچا رہے ہیں، جب آپ کا شور مکمل ہو جائے تو پھر آ کر مناظرہ کر لیں۔ لیکن یہ لوگ شور شرابے سے باز نہیں آئے۔

مفتی انور مدظلہ کا تقویٰ......اور......مولوی خضر حیات کی ایک اور چالاکی

مولوی خضر حیات کو معلوم ہے کہ استاذِ مکرم مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہم کسی بھی قسم کی تصویر اور ویڈیو کے قائل نہیں ہیں۔ اِس لیے وہ شدید مجبوری کے علاوہ اپنے اختیار سے نہ تصویر بنواتے ہیں نہ ویڈیو۔ مولوی خضر حیات جانتا تھا کہ جب تک ویڈیو کیمرے چلائے رکھیں گے، مفتی انور صاحب سامنے نہیں آئیں گے۔ چنانچہ اُس نے یہ کھیل بھی کھیلا اور ہر طرف ویڈیو بنانے والوں کو پھیلا دیا، تاکہ اگر مفتی صاحب آئیں بھی تو یہ ماحول دیکھ کر واپس کمرے میں چلے جائیں۔ گویا مفتی صاحب کے تقویٰ، للّٰہیت اور احتیاط کا بھی مولوی خضر حیات نے ناجائز فائدہ اُٹھایا، اور مناظرے سے فرار کے لیے اسے بھی آڑ بنایا۔ لیکن کوئی بات نہیں، مفتی صاحب جسے گناہ سمجھتے ہیں، اُس سے اُنہوں نے اپنے آپ کو بچایا اور مولوی خضر حیات نے دھوکہ دھی، فراڈ، مسجد کی بے ادبی، دشنام طرازی وغیرہ سارے گناہ اپنے کھاتے میں جمع کر لیے۔

یہ مناظرہ نہیں، لڑائی ہے:

ہم نے مولوی خضر سے پھر کہا کہ: دونوں طرف کے بیس بیس آدمی بیٹھتے ہیں، باقی افراد کو آپ واپس بھیج دیں۔ یا آپ تین افراد کے ساتھ اندر کتب خانے میں آ جائیں، لیکن اس نے کہا: ہم جتنے افراد لے کر آئے ہیں، ان سب کے سامنے بیٹھنا ہوگا۔ اور وہ سب لوگ نہ تو خاموش ہونے کا نام لے رہے تھے، نہ ہی بیٹھنے کا، ہم نے کہا: یہ تو لڑائی ہے، مناظرہ نہیں، مناظرے کا ماحول بنائیں۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا، ایک عالم سے کسی غیر مسلم نے کسی عنوان پر مناظرہ طے کیا، جب مناظرے کا وقت آیا تو وہ غیر مسلم کہنے لگا: کھانے کا مناظرہ ہوگا کہ کون زیادہ کھاتا ہے۔ اُن عالم نے فرمایا: زیادہ کھانے کا مناظرہ کرنا تھا تو بیل کے ساتھ کر لیتے، وہ تم سے زیادہ کھاتا ہے۔ مولوی خضر حیات نے بھی شور شرابے، گالم گلوچ، زبان درازی، بکواس، نعرے بازی، دشنام طرازی اور لڑائی جھگڑے کا مقابلہ کرنا تھا تو اپنے جیسے کسی غنڈے و بدمعاش سے کر لیتا۔

جب ہم نے دیکھا کہ لڑائی کا ماحول ہے، اور یہ شور شرابے، نعرے بازی، بدزبانی، چیلنج بازی کر رہے ہیں اور اس کی پورے اہتمام سے ویڈیو بنا رہے ہیں تو میں نے بھی اپنے ساتھیوں کو بلا لیا، ساتھیوں

کے آنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ اِس دوران یہ شورشرابا کرتے رہے۔ ہمارے بار بار کہنے کے باوجود یہ لوگ مناظرے کے لیے تیار نہیں ہوئے، صرف للکارے مارتے رہے اور بدزبانی و نعرے بازی کرتے رہے، مسجد کے تقدس کو مسلسل پامال کیا اور لڑائی و شوروغل کا ماحول رہا، جب ہمارے ساتھی آ گئے تو مولوی خضر حیات نے راہِ فرار اختیار کی اور پتلی گلی سے نکل گیا۔

کچھ اپنوں کی ''مہربانیاں''

مولوی خضر حیات اور مماتی لوگوں نے جو بدزبانی کی، جھوٹ بولے اور ہذیان بکے وہ تو اپنی جگہ، اِس موقع پر ہمارے بعض ''اپنے'' بھی حقائق معلوم کیے بغیر بے بنیاد فلسفے جھاڑنے لگ گئے، آخر کو اُن کی اتنی جلدی کیا تھی کہ حالات و واقعات معلوم کرنے سے پہلے ہی اُنہوں نے مضمون لکھ مارا اور اُس میں کئی جھوٹ بھی جھونک دیئے۔ بلکہ ایک صاحب کے بارے میں تو ایک ساتھی نے بتایا ہے کہ جس وقت مولوی خضر حیات ہماری مسجد میں تھا، اُن صاحب نے لاہور میں بیٹھے اُسی وقت حضرت مفتی انور صاحب اور دیگر حضرات کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا۔ پھر اُن کی تحریر میں کئی باتیں خلافِ حقیقت بھی آ گئیں، جن سے اُن کو آگاہ بھی کیا گیا، لیکن وہ بجائے رجوع اور معذرت کرنے کے لیپا پوتی اور مزید خلافِ واقعہ باتیں کرنے لگے۔ نامعلوم اُن کو حضرت مفتی محمد انور اوکاڑوی صاحب سے کوئی خار تھی، یا مولوی خضر حیات کے بارے اُنہوں نے جو کچھ پہلے لکھا تھا، اُس کی تلافی کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے تھے، یا پھر اپنے آپ کو ''حق گو'' کہلوانے کے شوق میں سچ اور جھوٹ کا فرق ختم کر رہے تھے۔ بہرحال اُن صاحب کی تحریر مفتی انور صاحب سے بغض و حسد یا مولوی خضر حیات سے ہمدردی و محبت کی بنا پر ہے۔ نیز فرضی خیالات اور خلافِ واقعہ باتوں وغیرہ کا پلندہ ہے۔[1]

---

[1] چنانچہ اُن صاحب نے ایک خلافِ واقعہ بات یہ لکھی کہ: ''ہمارا یہ مضمون حضرت اوکاڑوی، انصر باجوہ صاحب (راقم) اور وڑائچ صاحب کے مشورہ ہی سے چھپا ہے۔'' حالانکہ ہمیں تو مضمون کا علم ہی اشاعت کے بعد ہوا۔ اور ہماری رائے میں اُن کی یہ تحریر مسلکِ اہلِ سنت دیوبند کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔

اِسی طرح اُنہوں نے ایک خلافِ واقعہ بات یہ بھی لکھی کہ: ''نہایت بے اعتنائی اور غفلت کے ساتھ اُنہیں (حضرت مفتی انور اوکاڑوی مدظلہم کو) لوکل گاڑی سے واپس ملتان روانہ کر دیا گیا۔'' حالانکہ حضرت اوکاڑوی مدظلہم خصوصی (سپیشل) کار میں ملتان گئے تھے، اور مولانا عبدالرحیم چاریاری، مولانا ابوایوب قادری اور مولانا عبداللہ عابد وڑائچ مدظلہم تینوں حضرات: حضرت اوکاڑوی مدظلہم کے ہمراہ تھے۔ جب بعض اَحباب نے اُن صاحب کو یہ حقیقت بتائی تو وہ صاحب' بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے کہنے لگے کہ: ''خود مفتی (انور) صاحب نے مجھے بتایا کہ: مجھے بس پر بٹھایا گیا ہے۔'' حالانکہ یہ بھی بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ (محمد انصر باجوہ) ۱۲

باقی رہی یہ بات کہ: حضرت مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہ کو مولوی خضر حیات کے مقابلے کے لیے لانا چاہیے تھا یا نہیں؟ اِس میں اپنی اپنی رائے ہوسکتی ہے، لیکن اِس کو مناسب اَنداز میں بھی ذکر کیا جاسکتا تھا۔

اُن صاحب نے اپنے مضمون میں یہ تأثر بھی دیا ہے کہ مولانا مفتی انور اوکاڑوی متقی عالم تو ہیں، لیکن مناظرانہ صلاحیت نہیں رکھتے، اِس بارے میں یہی کہوں گا کہ: ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے، موچی نہیں۔ اُن صاحب کا یہ میدان ہی نہیں، اِس لیے اُن کے تبصرے کی کوئی حیثیت نہیں۔ نیز اُن کی دیکھا دیکھی ایک اور صاحب نے بھی کہہ دیا کہ: ''حضرت مدرس ہیں، مناظر نہیں۔'' حالانکہ حضرت کئی کامیاب مناظرے کرچکے ہیں، اور اُن مناظروں میں شریک جید علماء حضرت کی بہترین مناظرانہ صلاحیت کے عینی گواہ ہیں۔ اگر حضرت کی شاندار مناظرانہ صلاحیت مبصر موصوف کے علم میں نہیں تو اِس میں حضرت کی صلاحیت کا کیا قصور ہے؟ بھلا اہل علم بھی ایسے بے بنیاد دعوے کیا کرتے ہیں؟ فالی اللہ المشتکیٰ

احباب کا شکوہ ہے کہ: مفتی انور صاحب کو دعوت دی تو مماتی غنڈہ گردی کی روک تھام کا انتظام بھی کرنا چاہیے تھا۔ تو اِس کوتاہی کو میں تسلیم کرتا ہوں، واقعی مجھے انتظام کرنا چاہیے تھے، مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ: ہمیں مولوی خضر حیات سے اِس دھوکہ دہی اور غنڈہ گردی کی قطعاً اُمید نہیں تھی۔

اِس کے علاوہ بھی اگر میری کوئی بات یا کوئی عمل قابل اصلاح ہو تو ہمارے بڑے مجھے اُس کی طرف توجہ دلائیں، میں اِن شاء اللہ اُس کی اصلاح کروں گا۔ لیکن اُن صاحب نے جس طرح خلافِ واقعہ طور پر مماتیوں کو فاتح اور اپنے محبوب وممدوح خضر حیات کو بہادر وجری بنا کر پیش کیا ہے، یہ اُن کا مسلک اہل سنت اور عقیدہ حیات کے خلاف تاریخی جرم ہے، جس کا جواب اُن کو روزِ قیامت دینا ہوگا۔

میں شکر گزار ہوں مولانا ابو مجاہد بالا کوٹی، مولانا مفتی مجاہد قادری اور دیگر حضرات کا جنھوں نے اِس موقع پر اُن صاحب کی غلط، خلافِ واقعہ اور غیر معقول تحریر کی تردید کی اور علمائے اہل سنت دیوبند اور عقیدہ حیات کو نقصان پہنچانے کی سنگین واحمقانہ کوشش کو ناکام بنا دیا۔

اہل حق کی طرف سے مولوی خضر حیات کے چیلنج کی قبولیت کا اِعادہ:

ہم الحمد للہ اہل السنۃ والجماعۃ دیوبند ہیں، اہل حق ہیں، اور مماتیوں کو اہل سنت سے خارج سمجھتے ہیں۔ ہم ''اشاعۃ التوحید والسنۃ'' کے مولوی خضر حیات کی طرف سے کیے گئے مناظروں کے چیلنج کو شروع سے قبول کرتے چلے آئے ہیں اور اَب بھی قبول کرتے ہیں۔ مولوی خضر حیات جب بھی چاہے مناظرے کی جگہ، وقت اور شرائط طے کرکے مناظرہ کرلے۔ (لیکن واقعی مناظرہ کرے۔) مناظرے کے موضوع وہی ہیں جن کا ہماری طرف سے اعلان ہوچکا ہے اور جن پر مولوی خضر حیات عرصہ دراز سے چیلنج بازیاں کررہا ہے۔

[۱]۔ عقیدہ حیات النبی۔ [۲]۔ سماع موتیٰ کا عقیدہ شرک ہے یا نہیں؟ [۳]۔ دیوبندی کون؟

مولوی خضر حیات میں اگر ہمت و جرأت ہے اور وہ بڑھکیں مارنے، اپنوں میں شیر بننے اور غنڈہ گردی و دشنام طرازی کرنے کے علاوہ واقعی مناظرہ بھی کرسکتا ہے تو میدان میں آئے۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر مناظرہ کرے۔ تاکہ اُس کی ''قابلیت'' اور اُس کے عقیدے کی ''حقیقت'' سب پر عیاں ہوجائے۔

اور دنیا بھر کا جو مماتی مولوی خضر حیات کو ہمارے ساتھ مناظرے کے لیے تیار کردے، اُسے بھی دس ہزار نقد انعام دیا جائے گا۔ لیکن ''نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار اُن سے یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں''

فیس بک وغیرہ پر مماتی لوگ مولوی خضر کو ''مبارک باد'' دے رہے ہیں۔ اُن سے گزارش ہے کہ مبارک باد کے ساتھ یہ بھی بتایا کریں کہ: کس چیز کی مبارک ہے، مسجد کی بے حرمتی کی، دھوکہ دینے کی، گالیاں بکنے کی، غنڈہ گردی کی یا مناظرے سے فرار کی؟ کیونکہ اِس کے علاوہ تو مولوی خضر نے وہاں کچھ کیا ہی نہیں۔

☆......☆......☆......☆

ختم نبوت: زندہ باد	یا اللہ مدد	خلافت راشدہ: حق چار یارؓ

عظمتِ اہل بیت کانفرنس

مورخہ: ۲۵/ اکتوبر، بروز جمعۃ المبارک، بعد نمازِ مغرب (مقام کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ)

بیاد

قائد اہل سنت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ	امام اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ
فقیہ العصر مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ	مفسر قرآن مولانا صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ
پیر طریقت حضرت سید نفیس الحسینی شاہ رحمہ اللہ	امین ملت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ

مندوبین

حضرت مولانا قاضی ظہور الحسین اظہر مدظلہ، چکوال	حضرت مولانا فضل الرحیم اشرفی مدظلہ، لاہور
حضرت مولانا منیر احمد منور مدظلہ، کہروڑ پکا	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن سومرو مدظلہ، سندھ
حضرت مولانا فضل سبحان مدظلہ، کراچی	حضرت مولانا نعیم الدین مدظلہ، لاہور
حضرت مولانا مفتی محمد حسن مدظلہ، لاہور	حضرت مولانا محمود عالم اوکاڑوی مدظلہ
حضرت مولانا مفتی شاہد عبید مدظلہ، لاہور	حضرت مولانا مفتی خرم یوسف مدظلہ، لاہور

الداعی الی الخیر: (مولانا) عبدالشکور حقانی، جامعہ حقانیہ، قینچی، لاہور۔ رابطہ: 0322-4410730

عرض خادم حمزہ احسانی

ایک اور احمد سعید ملتانی!

اُمت مسلمہ کی مقدس ہستیوں اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر تبرا کرنا، گالیاں بکنا اور اُنہیں برا بھلا کہنا روافض کے مذہب کا لازمی حصہ ہے، اِس کے بغیر شیعوں کی شیعیت مشکوک و نا قابل قبول رہتی ہے۔ لہٰذا وہ اِس ''عبادت'' کو پورے اہتمام سے اَدا کرنے کو اپنا ''مذہبی فریضہ'' سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو سنی کہلوانے والے ایسے رافضی مزاج لوگ بھی تاریخ میں گزرے ہیں جو اِس ''تبرائی عبادت'' میں روافض کے نقش قدم پر ہیں۔ ایسے ہی بدبخت لوگوں میں سے ایک بدنام زمانہ نام احمد سعید ملتانی (چتروڑ گڑھی) کا ہے، جس کا تعلق ''جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ'' سے تھا، اور وہ مماتی فرقہ کے بانی (عقیدہ حیات النبی کے پہلے منکر) مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری کا خاص چہیتا تھا۔ احمد سعید ملتانی کی زبان وقلم سے نہ اکابر اہل سنت دیوبند رحمہم اللہ محفوظ تھے، نہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ جیسے اہل سنت کے مسلم امام اور نہ اُن سے پہلے یا بعد کے دیگر لوگ۔

پہلے پہل تو جب وہ اکابر اہل سنت دیوبند، امام ابن کثیر حتی کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نام لے کر بے ادبیاں کرتا تھا تو سید عنایت اللہ شاہ صاحب اُسے اپنا جانشین قرار دیتے تھے، لیکن جب اُس کی ''خوش اخلاقی'' کا رُخ خود سید عنایت اللہ شاہ صاحب کی طرف ہو گیا تو پھر اُنھیں اپنی پاک دامنی کا خیال آنے لگا اور احمد سعید ملتانی اُن کو ''گستاخ و بے اَدب'' نظر آنے لگا۔ شاید اُن کا دامن اکابر اہل سنت دیوبند، امام ابن کثیر اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے زیادہ پاک تھا۔ ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پھر ایک وقت آیا کہ احمد سعید ملتانی کا ہاتھ اَحادیث طیبہ اور امام بخاریؒ کے گریبان تک جا پہنچا اور ''قرآن مقدس بخاری محدث'' جیسی بدبودار کتاب معرض وجود میں آئی۔ اور رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ ''**اذا لم تستحیی فاصنع ما شئت** '' اور ''بے حیاباش ہر چہ خواہی کن'' کا مصداق احمد سعید ملتانی حضورؐ کے بارے میں بھی غیر مؤدبانہ جملے کہنے لگا۔ بالآخر اِسی بے ادبی و گستاخی کو ساتھ لیے دنیا سے چلا گیا۔

آج کل ''جمعیۃ اشاعۃ التوحید والسنۃ'' کے ہی خضر حیات نامی ایک صاحب' احمد سعید ملتانی کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں۔ اللہ کرے وہ اُس کے انجام بد سے عبرت حاصل کر کے ہدایت پا لیں۔ ورنہ اگر یہ صاحب اِسی روش پر چلتے رہے تو لوگ احمد سعید ملتانی کو بھول جائیں گے۔ اور خاکم بدہن ایک وقت آئے گا کہ یہ صاحب ''سنیت'' کے نام وعنوان کو بھی خیر باد کہہ جائیں گے۔ اعاذنا اللہ منہ ☆☆☆☆

راوی: محترم قاری محمد نعیم، سرگودہا تحریر: حمزہ احسانی

دیکھنا بھائی! چارپائی آرام سے اُٹھانا، میرے والد کو تکلیف نہ ہو!

......مولانا ضیاء اللہ شاہ بخاری کے ایک جملے نے کایا پلٹ دی......

بندہ محمد نعیم پہلے حیات النبی کا منکر یعنی ''مماتی'' تھا۔ بندہ کے استاذِ مکرم مشفق معظم مولانا قاری عبدالرحمٰن ضیاء مدظلہم [مدیر: مدرسہ تعلیم القرآن حسینیہ سرگودہا] کو بھی بندہ کی بدعقیدگی کا معلوم تھا۔ چنانچہ وہ گاہے بگاہے تھوڑی تھوڑی بات کان میں ڈالتے رہتے تھے، اور یقیناً بندہ کی ہدایت کے لیے دعائیں بھی ضرور فرماتے ہوں گے۔ لیکن استاذِ محترم کی موقع بموقع محسوس وغیر محسوس انداز میں مختلف طریقوں سے کی گئی گفتگوؤں کے باوجود اَبھی میری ہدایت کا وقت نہیں آیا تھا، اِس لیے میں حیات النبی کے اِنکار پر ہی قائم ودائم تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ حیات النبی کے قائل بزرگوں میں سے کسی کی بے اَدبی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اِس عنوان پر کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ کرتا تھا، بلکہ اِس سلسلے میں کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا، (شاید بے اَدبی نہ کرنے کی وجہ سے ہی اللہ پاک نے مجھے ہدایت سے نواز دیا۔) لیکن اَندر سے میرا عقیدہ پکا مماتیوں والا ہی تھا کہ: نبیوں کے دنیا والے جسم اپنی زمینی قبروں میں حیات نہیں ہیں۔

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میری ہدایت کا وقت آ پہنچا اور اُس کا سبب بھی مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری کا جنازہ اور اُن کے فرزند مولانا سید ضیاء اللہ شاہ بخاری کا ایک قول بن گیا۔ ہوا یوں کہ مجھے مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری کی وفات کی اطلاع ملی، میں جنازے میں شرکت کے لیے سرگودہا سے گجرات گیا، جہاں اُن کا جسد خاکی رکھا تھا، جنازے سے کچھ دیر قبل میں بھی وہاں پہنچ گیا، جب جنازے کے لیے چارپائی لے جانے کا وقت ہوا اور حاضرین نے چارپائی کو اپنے کندھوں پر بلند کیا تو مولانا ضیاء اللہ شاہ صاحب کہنے لگے: ''دیکھنا بھائی! چارپائی آرام سے اُٹھانا، میرے والد کو تکلیف نہ ہو!'' مولانا ضیاء اللہ شاہ صاحب سے یہ جملہ سُن کر میں تو گویا سکتے میں آ گیا کہ: ساری زندگی ہم اِن حضرات سے یہی سنتے رہے کہ نبی وفات کے بعد زندہ نہیں، بلکہ اُن کا جسد اَطہر (نعوذ باللہ) لکڑی اور پتھر کی طرح بے جان ہے۔ اور اَب جب اپنے والد کی باری آئی تو ''آرام سے اُٹھانا، میرے والد کو تکلیف نہ ہو!'' میں جس قدر اِسے سوچتا رہا میرے قدم ہدایت کی طرف بڑھتے رہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا، میرے استاذِ محترم کی دعائیں اور محنت رنگ لائی اور میں مماتی عقیدہ سے توبہ تائب ہو کر عقیدہ حیات النبی کا قائل ہو گیا۔ الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ ☆

وفیات

-ڈاکٹر عبدالباسط خان صاحب [راولپنڈی] کے ماموں رحمہ اللہ- قاری سعید احمد صاحب [مدرس: جامعہ قاسمیہ لاہور] کے والدِ محترم رحمہ اللہ -جامعہ مظہریہ حسینیہ [جہان سومرو] کے طلبہ سجاد علی کی چچی، راشد کی دادی رحمہا اللہ- پروفیسر اسلم بیگ صاحب [اسلام آباد] کی ہمشیر محترمہ رحمہا اللہ- قائد اہل سنتؒ کے مسترشد مولانا عبدالمعبود رحمہ اللہ [راولپنڈی]-مولانا عبدالرحیم چار یاری کی ہمشیر محترمہ رحمہا اللہ اور چچازاد بھائی رحمہ اللہ- جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا کے ناظم دفتر مولانا افتخار احمد رحمہ اللہ- دارالعلوم کراچی، شعبہ تجوید وقرآت کے قدیم استاذ مولانا قاری عبدالمالک رحمہ اللہ- جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے امام مولانا طاہر الحسن کی والدہ محترمہ رحمہا اللہ- ٹھیکیدار اُستاد محمد سومرو کی والدہ، جامعہ مظہریہ حسینیہ کے مدرس مولانا شعیب کی دادی رحمہا اللہ- مولانا حافظ شاہ محمد رحمہ اللہ [بانی: جامعہ قاسمیہ لاہور] کی اہلیہ محترمہ رحمہا اللہ- جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے قدیم استاذ مولانا عبدالرحمٰن رحمہ اللہ- مولانا عبدالرحمٰن اشرفیؒ کی اہلیہ محترمہ رحمہا اللہ- شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمہ اللہ چھوٹی صاحبزادی رحمہا اللہ- الطاف مرحوم [بھیں، چکوال] کی اہلیہ رحمہا اللہ- مولانا علی محمد رحمہ اللہ [کبیر والہ] کی صاحبزادی مولانا مفتی ابوبکر سعید الرحمٰن کی اہلیہ رحمہا اللہ- جناب عبدالباسط منیر صاحب کے والد گرامی کیپٹن (ر) محمد منیر رحمہ اللہ [چکوال]- حاجی عبدالوہاب رحمہ اللہ کے خادم خاص رائے ونڈ مدرسہ کے قدیم استاذ مولانا فہیم رحمہ اللہ- شیخ الحدیث جامعہ اشرف المدارس مولانا محمد اسحاق رحمہ اللہ- محترم حافظ منیر صاحب گجرات کے برادرِ مکرم رحمہ اللہ- مولانا محمد سلیم نور پوری [بہاول پور] کے والد گرامی رحمہ اللہ- ابن سفیر ختم نبوت مولانا الیاس چنیوٹی کے پوتے سلیم اللہ رحمہ اللہ- جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک شعبہ تجوید کے سابق مدرس قاری محمد عبداللہ رحمہ اللہ- فاضل دارالعلوم مدنیہ بہاول پور مولانا محمد بلال قاضی کے برادر گرامی قاضی عبدالعزیز رحمہ اللہ- معارف اسلامیہ گکھڑ اور جامعہ رحمانیہ گوجرانوالہ کے سابق استاذ مولانا مفتی محمد ایاز رحمہ اللہ- قاضی محمد شاہد آصف ولد قاضی محمد اصغر رحمہ اللہ [بھیں، چکوال]- جامعہ عربیہ سعدیہ خانقاہ سراجیہ کے استاذ و ناظم تعلیمات مولانا قاری عصمت اللہ رحمہ اللہ- حضرت قائد اہل سنتؒ کے دیرینہ رفیق قاضی محمد طیب رحمہ اللہ [مونا، چکوال]- مولانا عطاء اللہ [استاذ الحدیث: جامعہ امدادیہ فیصل آباد] کی اہلیہ رحمہا اللہ- بزرگ عالم ومصنف مولانا محمد الیاس بالاکوٹی رحمہ اللہ [جھنگ]- مولانا محمد سرفراز [بہاول پور] کے بھائی رحمہ اللہ- مولانا محمد عمر معاویہ فاضل جامعہ مفتاح العلوم سرگودہا کے والدِ محترم رحمہ اللہ- جامعہ اشرفیہ لاہور کے استاذ الحدیث مولانا محمد اکرم کشمیری رحمہ اللہ- مجلّہ صفدر کی مجلس مشاورت کے رکن مولانا رب نواز کی والدہ محترمہ رحمہا اللہ- جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے سابق مفتی مولانا مفتی محمود الحسن طیب رحمہ اللہ- شیخ الحدیث مولانا عبدالقدوس قارن مدظلہ کی خوش دامن صاحبہ رحمہا اللہ- جامعہ مفتاح العلوم سرگودہا کے استاذ الحدیث مولانا اختر حسین کی والدہ محترمہ رحمہا اللہ- محترم سہیل امین صاحب [مانسہرہ] کی والدہ محترمہ رحمہا اللہ- سفیر ختم نبوت مولانا منظور احمد چنیوٹی کے چھوٹے بیٹے رحمہ اللہ

قارئین سے تمام مرحومین کی مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے۔